اُمید کا دیا

علیم الحق حقی



شہدا کے نام

جن کا خون پاکستان کی بنیادوں میں ہے۔
جن کا خون پاکستان کے تحفظ کے لئے بہا
جن کا ہم سب پر قرض ہے۔

مجھے خوب یاد ہے' وہ ۱۶ فروری ۹۶ء کی رات تھی!

میری بیوی ناہید نے چائے کی پیالی میرے سامنے رکھی' بھری ہوئی ایش ٹرے کو عجیب سی نظروں سے دیکھا اور بولی۔ "کیا بات ہے؟ لکھتے کیوں نہیں؟"

"کیسے لکھوں؟" میں نے بے بسی سے کہا۔ "ایسا پیچ پھنسا ہے کہ نکلتا ہی نہیں؟"

"دن بھر میں تمہیں چائے بنا بنا کر پلاتی رہی۔ تم نے سگریٹ کے ٹوٹوں سے ایش ٹرے بھر دی۔ یہ کیسا پیچ ہے کہ پھر بھی نہیں نکلا؟" ناہید نے جھنجلا کر کہا۔

"میں کیا کر سکتا ہوں۔ کچھ سوجھ ہی نہیں رہا ہے۔"

وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی "مجھے بتاؤ' کیا مسئلہ ہے؟"

"ایک پڑھا لکھا شخص ہے جو بینائی سے محروم ہو گیا ہے۔" میں نے اسے بتایا۔ "چار سال کی ایک بیٹی کے سوا اس کا کوئی نہیں۔ وہ بہت خوددار ہے' کسی سے مدد مانگنا اسے گوارا نہیں۔ پے در پے محرومیوں اور مصائب نے اسے اتنا تلخ کر دیا ہے کہ اس نے اللہ سے بھی لڑائی کر لی ہے۔"

"توبہ توبہ!" میری بیوی اپنے رخسار پیٹنے لگی۔ "تم تو کفر لکھتے ہو بھئی......"

"اس جھگڑے میں نہ پڑو۔ بات ایک پیچ کی ہو رہی ہے۔" میں نے بے حد عاجزی سے اپیل کی۔

"خیر.... سناؤ۔" ناہید نے بہت بے زاری سے کہا۔

"اس نے بہ ہزار دقت اپنی آنکھوں سے سمجھوتا کیا۔ اپنی دوسری حسوں کو ڈویلپ کیا۔ یہاں تک کہ اس میں اتنی خود اعتمادی آگئی کہ وہ اس محرومی کے باوجود اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ ربڑ کی واٹر بالز بنا کر بیچتا ہے۔ حساب کتاب کا آدمی

ہے۔ جو کماتا ہے' اس کے تین حصے کرتا ہے۔ ایک حصہ واٹر بانڈز خریدنے کے لئے' دوسرا روزمرہ کی ضروریات کے لئے اور تیسرا پس انداز کرنے کے لئے۔ رمضان کا مہینہ ہے اور اسے اپنی بچی کو عید کے کپڑے دلانے ہیں۔ اسے بہت اچھی عید کرانی ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ رمضان کا عشرہ شروع ہو گیا ہے اور اس کے پاس بچی کی بہت اچھی عید کرانے کے لئے معقول رقم موجود ہے .....“

”تو اس میں پیچ کیا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ مجھے اس کو بھیک مانگنے پر مجبور کرنا ہے؟“

”تو کر دو۔ یہ کون سی بڑی بات ہے تمہارے لئے۔“ میری بیوی نے نہایت اطمینان سے کہا۔

”کیسے کروں؟“ میں نے تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”وہ بہت خوددار آدمی ہے۔ سوچو کہ جو اللہ سے کچھ نہیں مانگتا' وہ اس کے بندوں کے سامنے ہاتھ کیسے پھیلا سکتا ہے۔“

یہ بات میری بیوی کی سمجھ میں آ گئی۔ ”ہاں' یہ تو ہے۔ تم اس سے بھیک نہیں منگوا سکتے۔“

”مگر مجھے یہ کرنا ہے۔ اس کے بغیر کہانی منطقی انجام تک کیسے پہنچے گی۔“

”لیکن ٹھیک ٹھاک کمانے والا خوددار آدمی بھیک کبھی نہیں مانگے گا۔“

”مجبور ہو جائے گا تو مانگے گا۔“

”میری سمجھ میں تو نہیں آتی یہ بات۔“

”عید سے دو تین دن پہلے کوئی اسے لوٹ لے .... پیسے پیسے کو محتاج کر دے تو وہ کیا کرے گا؟“

”ہاں' یہ تو ہے۔ بس تو پھر مسئلہ کیا ہے؟“

”مسئلہ اس کے لٹنے کے طریقہ کار کا ہے۔“

میری بیوی نے مجھے یوں دیکھا' جیسے میں روئے زمین پر سب سے بے وقوف آدمی ہوں۔ ”لو...... یہ بھی کوئی مسئلہ ہے۔ یہاں لوٹنے والے آنکھوں والوں کو لوٹ لیتے ہیں۔ اس بے چارے اندھے کا لٹنا کیا مسئلہ ہو سکتا ہے۔“

”بھئی' وہ بہت الرٹ ہے۔ ذہین ہے .....“

”سب سے ذہین لوٹنے والے ہوتے ہیں۔“ میری بیوی نے سادگی سے کہا۔

”اس نے اپنی دوسری حسوں سے بصارت کا کام لینا سیکھ لیا ہے۔ وہ کسی کے پاؤں کی چاپ کبھی نہیں بھولتا۔ کوئی بھی ایک بار اس کے قریب سے گزرا تو وہ قدموں کی چاپ سے اسے پہچان لیتا ہے۔ اسے چاپ سے یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ آنے والا کس ارادے اور نیت سے اس کی طرف آ رہا ہے۔ ایسے آدمی کا لٹنا آسان نہیں ہوتا۔“

”کمال کرتے ہو تم۔ کوئی آ کر پستول کنپٹی پر رکھ دے تو مسلح آنکھوں والے بھی سب کچھ نکال دیتے ہیں۔ اس اندھے نہتے کی کیا بساط ہے' یہی ہو رہا ہے آج کل۔“

”تم سمجھ نہیں رہی ہو۔“ میں بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ ”ایسے لٹنے سے وہ خود اعتمادی سے محروم تو نہیں ہو گا۔ بے بسی کا خوفناک احساس اسے نہیں پچھاڑے گا۔ سچ ہے' پستول کے زور پر تو آنکھوں والے بھی لٹ جاتے ہیں۔ بے چارے اندھے کی کیا بساط ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے بے وقوف بنا کر یوں لوٹا جائے کہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ وہ آنکھوں سے محرومی کے ساتھ اس دنیا میں کبھی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ لوٹنے والے اسے لوٹتے رہیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس واقعے کے نتیجے میں وہ یوں ٹوٹے کہ اس کے پاس بھیک مانگنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔“

میری بیوی سوچ میں پڑ گئی۔ ”اچھا! تم یہ چاہتے ہو کہ اس لٹنے میں اس کے اندھے ہونے کا دخل ہو اور اس کی یہ خوش فہمی دور ہو جائے کہ آنکھوں کی کمی کا کسی طرح ازالہ ہو سکتا ہے۔“

”ہاں' یہی بات ہے۔“ میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔

”یہ تو واقعی پیچ ہے۔“ میری بیوی نے تائید میں سر ہلا دیا۔ ”لیکن یہ تو تمہاری کہانی لگتی ہے۔“

”کیسے؟ میں تو اندھا نہیں ہوں۔“ میں نے بھنا کر کہا۔

”عید کے دن تمہارا انجام بھی وہی ہو گا۔ بچوں کے کپڑے بھی نہیں بنیں گے۔“

پتہ بھی ہے' تین دن رہ گئے ہیں عید میں۔"

"بچوں کی فکر نہ کرو' وہ میرے بچے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ جب ہوتا ہے تو انہیں سب کچھ مل جاتا ہے۔ وہ کبھی مطالبہ نہیں کرتے۔"

"لیکن میرا دل تو دکھے گا عید کے دن اور پھر راشن بھی ختم ہو رہا ہے۔"

اس پر مجھے تشویش ہوئی "کیا صورت حال ہے؟"

"بس کل رات تک کام چل جائے گا۔ پھر آٹا' دال' چاول' گھی' شکر..... سب ختم" میری بیوی نے کہا۔ پھر تیز لہجے میں بولی۔ "یعنی پرسوں تمہیں روزہ رکھنا پڑے گا۔"

میرا تشویش سے برا حال تھا۔ مجھ سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ "کہانی پوری ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ' کہانی کتنی باقی ہے؟"

"آخری صفحہ ہے۔ دس ایک صفحے اور لکھنے ہیں۔ روانی سے لکھی جائے تو ایک دن کا کام ہے لیکن یہ پیچ....."

میری بیوی نے میری بات کاٹ دی۔ "یہ پیچ تمہارے اندھے ہیرو کی ہی نہیں' ہماری عید بھی خراب کر دے گا۔" پھر وہ جھنجلا گئی۔ "چھوڑو یہ ایچ پیچ کے نخرے۔ اسے لڑواؤ جلدی سے اور کہانی پوری کر کے دے آؤ' میں بہت پریشان ہوں۔"

"ارے واہ..... ذرا سی جلد بازی سے میں کہانی تباہ کر دوں۔"

"مجھے کہانی کی نزاکتوں کا نہیں پتا۔ میں بس زندگی کی سختیوں سے واقف ہوں۔"

میں نے چونک کر اسے غور سے دیکھا۔ یہ آخری بات کہتے ہوئے اس کے لہجے میں تھکن اتر آئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کس کیفیت سے گزر رہی ہے۔ وہ تو بڑی صابر و شاکر عورت تھی۔ کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لاتی تھی۔ اس نے کبھی مجھ سے کچھ طلب نہیں کیا تھا۔ وہ ہر حال میں خوش رہنے کی قائل تھی۔ میرا دل کٹنے لگا..... اس کے لئے بھی اور بچوں کے لئے بھی۔ بہت شدت سے احساس جرم ہوا۔ اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے میں نے الزام ادھر ادھر کرنے کی کوشش کی۔" ہر مہینے دس

پندرہ ہزار لاتا ہوں۔ پھر بھی تنگی میں کمی نہیں ہوتی۔"

کوئی اور بیوی ہوتی تو اس پر بپھر جاتی۔ کہتی' میکے نہیں لے جاتی ہوں۔ اللے تللے بھی نہیں کرتی لیکن وہ میری بیوی تھی .... ناہید۔ اس نے بے حد ٹھنڈے دھیمے لہجے میں کہا "پتہ تو ہے نہیں کہ مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ جینا مشکل ہو گیا ہے۔ گھر کے اخراجات کا پتہ نہیں' بس اپنے کونے میں بیٹھے ایران توران کی لکھتے رہتے ہو" وہ کہتے کہتے رکی پھر بولی "اور یہ بھی ہے کہ گھر میں برکت بھی نہیں ہے۔ کیسے ہو' یہ خیر و برکت کا مہینہ رمضان اللہ کا تحفہ ہے۔ مگر دیکھو' پورا مہینہ گزر گیا۔ تم نے ایک روزہ بھی نہیں رکھا۔ پتہ بھی ہے' آج جمعتہ الوداع تھا۔"

گفتگو اس رخ پر آئے گی' یہ مجھے اندازہ بھی نہیں تھا۔ میں گڑبڑا گیا' "تم جانتی ہو کہ سگریٹ نہ پیوں تو مجھ سے لکھا نہیں جاتا۔"

"جانتی ہوں" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"دیکھو' میں اپنے' تمہارے اور بچوں کے لئے رزق حلال کمانے کی کوشش کرتا ہوں" میں نے صفائی پیش کی۔

"معلوم ہے مجھے۔ ہمارے حقوق ادا کرنے کے لئے اپنی عاقبت کا خطرہ مول لیتے ہو" اس کا لہجہ ایسا تھا کہ میرے دل کو ریشم کے نرم و ملائم تار چھو گئے۔ وہ اٹھی' میری کرسی کے پیچھے آئی اور بڑی محبت سے میرے کندھے تھام لئے "مجھے معاف کر دینا اس کم ظرفی پر۔ کوئی ایسی پریشانی بھی نہیں۔ اللہ کا شکر ہے۔ گھر میں کبھی فاقہ نہیں ہوا ..... اور نہ انشاء اللہ کبھی ہو گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم پریشان نہ ہو' چائے پی لو' ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

وہ چلی گئی مگر میں اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس روز شاید وہ بہت زیادہ بوجھل ہو گئی تھی ورنہ وہ کبھی اس طرح بات نہیں کرتی تھی۔ وہ بہت خیال رکھتی تھی کہ میں پریشان ہوں گا تو کام پر برا اثر پڑے گا مگر اس روز مجھے یقین تھا کی اس کی باتوں کا اچھا نتیجہ نکلے گا اور وہ پیچ دور ہو جائے گا۔

میں نے چائے ختم کی اور سگریٹ جلا لی۔ میں اس پیچ کو دور کرنے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ صورت حال اب حوصلہ افزا بھی تھی اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دینے والی

بھی۔ کوئی خیال تھا جو ذہن میں ایک پل کے لئے چمکتا اور فوراً ہی بجھ جاتا تھا۔ مسئلہ حل ہوتے ہوتے رہ جاتا تھا۔

میں اس آنکھ مچولی میں الجھا ہوا تھا کہ ناہید چائے کی پیالی اٹھانے کے لئے کمرے میں آئی "سنو .... ایک بات کہوں' برا تو نہیں مانو گے؟"

"تمہاری بات کا میں برا کب مانتا ہوں۔ کہو۔"

"جمعتہ الوداع تو گزر گیا۔ آج رمضان کی ستائیسویں شب ہے۔ مسجد چلے جاؤ' عبادت کر لو۔"

"لیکن میں نے روزہ ایک نہیں رکھا...."

"تو شرمندہ بھی تو ہو۔ اللہ سے معافی مانگو۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ شرمندگی میں ایسی مبارک رات ضائع کر کے اپنا نقصان کیوں بڑھاتے ہو۔"

کوئی اچھا لمحہ تھا کہ بات سمجھ میں آ گئی!



اگر گھر کی صورت حال ابتر نہ ہوتی۔ اگر ناہید نے اس انداز سے بات نہ کی ہوتی اور اگر اس نے مجھے اس مبارک شب سے استفادہ کرنے پر نہ اکسایا ہوتا تو اس رات میں ہرگز گھر سے نہ نکلتا اور گھر سے نہ نکلتا تو میری زندگی یوں نہ بدلتی۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ یہ سب نہ ہوتا۔ یہ تو اللہ کی طرف سے تھا' جو مسبب الاسباب ہے' بہت مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔

میں محلے کی مسجد کا چراغاں دیکھتے ہوئے آگے نکل گیا۔ ذہن میں خیالات کی یورش تھی۔ سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ایک طرف کہانی کا پیچ پھنسا ہوا تھا۔ دوسری طرف یہ فکر تھی کہ گھر کا راشن ختم ہو رہا ہے۔ پرسوں تک پیسے نہیں آئے تو رمضان کے مہینے میں فاقے کی نوبت آ جائے گی۔ تیسری طرف عید کا خیال تھا۔ صرف بچوں کے نہیں' اس بار تو ناہید کے کپڑے بھی بننے چاہئیں۔ مگر کہانی پوری ہو اور اس کے ساتھ ہی ذہن کی سوئی پھر کہانی کے پیچ پر اٹک جاتی۔

میں محلے کی مسجد کے سامنے سے گزرا تو مجھے یاد تھا کہ میں عبادت کی غرض سے

نکلا ہوں لیکن میں اس وقت ذہنی یکسوئی اور ارتکاز سے محروم تھا' پریشان تھا۔ میں نے سوچا' سوچنے سے یہ بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ چہل قدمی بھی ہو جائے گی۔ مسجدوں کی تو یہاں کمی نہیں۔ جب جی چاہے گا' کسی مسجد میں چلا جاؤں گا۔ ابھی تو رات پڑی ہے۔

سو میں آگے ہی آگے چلتا رہا۔ سوچوں میں یوں گھرا ہوا تھا کہ وقت اور فاصلے کا احساس ہی نہیں رہا۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کتنی دیر سے چل رہا ہوں اور کتنا چل چکا ہوں۔ انتشار کے عالم میں وہ عجیب ارتکاز تھا۔ مجھے یہ ہوش بھی نہیں تھا کہ میں چل رہا ہوں۔

پھر ایک کتے کے بھونکنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ شاید میرے چونکنے کی کوئی اور صورت تھی ہی نہیں۔ کتوں سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے اور وہ آواز آئی بھی بہت قریب سے تھی۔ میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر گھوم کر دیکھا مگر کوئی کتا نظر نہ آیا۔ میں پریشان ہو گیا۔ اتنے قریب سے آنے والی کتے کی آواز وہم تو نہیں ہو سکتی اور کتا ہے تو نظر تو آئے۔ ورنہ تو یہ بڑی تشویش ناک بات ہو گی۔ وہ کسی بھی وقت اچانک مجھ سے جھپٹ پڑے گا اور مجھے جان بچانا مشکل ہو جائے گا۔

میں ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ دوبارہ بھونکنے کی آواز سنائی دی ..... اور اس بار کتا مجھے نظر آ ہی گیا۔ وہ کافی دور تھا اور مخالف سمت میں دوڑ رہا تھا یعنی مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں نے سکون کی سانس لی مگر وہ سکون وقتی تھا۔ کتے کو دیکھنے کے بعد میں نے جو کچھ دیکھا تھا' اسے دیکھ کر میرے دیوتا کوچ کر گئے۔

یہ انسانی فطرت کا کمال ہے۔ جب وہ پورے ارتکاز کے ساتھ کسی چیز یا شخص کی جستجو میں ادھر ادھر دیکھتا ہے تو اس کے سامنے' گردوپیش میں بہت کچھ ہوتا ہے لیکن وہ اسے نظر نہیں آتا اور جستجو پوری ہو جائے تو گردوپیش کو دیکھ کر اسے حیرانی ہوتی ہے۔

مگر میں حیران نہیں' دہشت زدہ ہوا تھا!

میں نے پھر گھوم کر چاروں طرف دیکھا مگر وہاں دیکھنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ جہاں دیکھنے کو گھپ اندھیرے کے سوا کچھ نہ ہو' وہاں اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہیں

دیتا۔ میں ساکت کھڑا ہو گیا اور ایک طرف نظر جما دی۔ نظر اللہ کی دی ہوئی وہ نعمت ہے جو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کسی حد تک راہ بنا لیتی ہے۔

میری نظر بھی ذرا دیر میں اس اندھیرے کی عادی ہو گی مگر اب بھی وہاں دیکھنے کو کچھ نہیں تھا۔ آسمان کے پیش منظر میں جابجا گہرے رنگ کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ وہ جھاڑیاں بھی ہو سکتی تھیں' میں نے گھوم کر دیکھا۔ چاروں طرف وہی منظر تھا۔ سر جھکا کر دیکھا تو اندازہ ہوا کہ میں پتلی سی ایک سڑک پر چل رہا تھا۔

میں چکرا گیا۔ یہ کون سی جگہ ہے۔ جہاں میں رہتا ہوں' وہاں دور دور تک میں نے کبھی ایسا صحرا اور یہ سڑک نہیں دیکھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں سر جھکائے چلتا رہا لیکن اتنا تو نہیں چلا ہوں کہ کسی اجنبی علاقے میں پہنچ گیا ہوں۔ ٹانگیں بھی اس کی تردید کر رہی تھیں کہ میں بہت چلا ہوں۔ میں پوری طرح تازہ دم تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ مجھے گھر سے نکلے بہت دیر نہیں ہوئی ہے۔

بہرکیف یہ طے تھا کہ مجھے اس وحشت ناک ماحول سے بھاگنا ہے .... جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہے اور آگے جانا مخدوش تھا۔ گھر کی طرف ہی چلا جائے۔ پلٹ کر ادھر چلوں جدھر سے آ رہا ہوں۔ یہ سوچ کر میں پلٹا لیکن اگلے ہی لمحے ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ پلٹ کر میں نے اسی طرف رخ کیا ہے' جدھر سے آیا ہوں۔

میں نے سمجھ لیا کہ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں۔ کتے کو دیکھنے کے لئے میں اتنی بار گھوما ہوں کہ اب یہ بتانا مشکل ہے کہ میں کس طرف سے آ رہا ہوں۔ میں تو یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ میں نے کتے کو کہاں دیکھا۔ سمتوں کا تو مجھے احساس ہی نہیں تھا۔

اب ایسے میں آدمی اللہ سے رہنمائی طلب کرنے کے سوا کیا کر سکتا ہے۔ میں نے بھی یہی کیا۔ اللہ سے دعا کی اور جس طرف قدم اٹھے' اس طرف چل پڑا۔ اب میں یہ امید ہی کر سکتا تھا کہ میں گھر کی سمت قدم اٹھا رہا ہوں۔

آتے ہوئے بے خبری میں جو میں نے سفر کیا تھا' اس کا پتہ ہی نہیں چلا تھا مگر اب شعور کے ساتھ سفر کرنے میں ایک ایک پل بہت بڑا لگ رہا تھا اور میں یہ بھی

نہیں جانتا تھا کہ میں واپس جا رہا ہو یا مزید آگے بڑھ رہا ہوں۔ اس وقت میری پہلی طلب تو یہ تھی کہ مجھے کہیں روشنی نظر آ جائے۔ میں روشنی کو ترس رہا تھا۔

کچھ آگے بڑھا تو اللہ نے میری سن لی۔ دور جلتی بجھتی ایک روشنی نظر آنے لگی۔ شروع میں تو میں اسے ستارہ سمجھا لیکن آگے بڑھتا گیا تو احساس ہوا کہ وہ ستارہ نہیں ورنہ میرے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ بلندی کی طرف جاتا لگتا اور اس کا وہ جلنا بجھنا فاصلے کی وجہ سے تھا۔ اسے دیکھ کر میری ڈھارس بندھی ورنہ میں بہت پریشان تھی کہ یہ کس لق و دق صحرا میں چل رہا ہوں کہ کہیں زندگی کے آثار نہیں۔ میں تو اپنے شہر میں اجنبی ہو کر رہ گیا تھا۔

میں اس روشنی کی طرف بڑھتا رہا۔ شروع میں تو ایسا لگا کہ وہ روشنی بھی میرے ساتھ اس سمت میں سفر کر رہی ہے کیونکہ اس کی طرف بڑھنے کے باوجود فاصلہ کم نہیں ہو رہا تھا مگر پھر اچانک فاصلہ سمٹتا محسوس ہونے لگا .... اور وہ بھی بہت تیزی سے۔

اس وقت میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میرا تجربہ تھا کہ نیکی .... کوئی بھی اچھا کام ابتدا میں مشکل لگتا ہے لیکن بعد میں بہت آسان ہو جاتا ہے اور بڑی روانی سے تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔ درحقیقت مجھے اس کا تجربہ نماز کے دوران ہیں ہوا تھا۔ یہ نہیں کہ میں کوئی نمازی ہوں بلکہ سچ یہ ہے کہ میں نماز بے قاعدگی سے بھی نہیں پڑھتا۔ کبھی دل میں اچانک لہر سی اٹھتی ہے تو اتنی طاقتور ہوتی ہے کہ اپنے زور میں بہا کر لے جاتی ہے۔ پھر میں نماز پڑھے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔

مجھے وہ پہلا موقع یاد آیا جب مجھے اس کا تجربہ ہوا تھا۔

اس روز میں بیٹھا ٹی وی پر براہ راست دکھایا جانے والا کرکٹ میچ دیکھ رہا تھا۔ کرکٹ پر میری جان جاتی ہے۔ ٹی وی پر کرکٹ میچ دکھایا جا رہا ہو تو میں ہر کام چھوڑ کر ٹی وی کے سامنے ..... زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد ..... کی تصویر بن کر بیٹھ جاتا ہوں۔ اس پر طرہ یہ کہ اس وقت سعید انور بیٹنگ کر رہا تھا۔ سعید انور کا میں ایسا فین ہوں کہ اس کی بیٹنگ چھوڑ ہی نہیں سکتا۔ مگر اس وقت میچ دیکھتے دیکھتے اچانک میرے اندر بے چینی کی ایک تیز لہر اٹھی۔ میں نے اسے سمجھنے کے لئے پہلو بدلا۔ اسی لمحے

میرے اندر سے کسی نے کہا ..... نماز پڑھنی چاہئے۔ میں نے سکرین کی طرف دیکھا۔ سعید انور نے ایک چھکا لگایا تھا۔

اس وقت چھوڑو یار' میں بڑبڑایا۔

لیکن بے چینی بڑھتی گئی۔ یہ نماز کا وقت وقت بھی تو نہیں ہے۔ میں نے جان چھڑانی چاہی مگر بے چینی نے مجھے اٹھ کر باہر کا جائزہ لینے پر مجبور کر دیا۔ باہر سورج غروب ہونے والا تھا۔ گویا مغرب کا وقت سر پر تھا۔

میں دوبارہ ٹی وی کے سامنے آ بیٹھا اور سعید انور کے دو خوب صورت کور ڈرائیوز دیکھے مگر سچ یہ ہے کہ اندر کی بے چینی مجھے انجوائے نہیں کرنے دے رہی تھی۔ اوور ختم ہوا اور ٹی وی پر کمرشلز دکھائے جانے لگے تو اس بے چینی نے مجھے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے لپک کر وضو کیا۔ باتھ روم سے نکلا تو اذان کی ابتدا ہو رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر میں نے جاء نماز بچھا لی مگر میرا دھیان اب بھی میچ میں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اچھا خاصا میچ نکل جائے گا اور سعید انور آؤٹ ہو گیا تو یہ میرا ذاتی نقصان ہو گا۔

مغرب کی نماز چھوٹتی ہے لیکن مجھے عصر کی نماز بھی پڑھنی تھی اس لئے میں اب بھی ہچکچا رہا تھا۔ مگر مجھے خود بھی پتہ نہیں چلا کہ میں نے کب عصر کی قضا کی نیت کر لی۔

پہلی دو رکعتیں کتنی طویل' کتنی مشکل تھیں' میں بتا نہیں سکتا۔ لگتا تھا کہ یہ چار رکعتیں پوری ہوتے ہوتے میچ ختم ہو جائے گا۔ ٹی وی کی آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی مگر نماز میں اتنا ارتکاز مرکوز تھا کہ ان کا مفہوم سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ بات اور ڈسٹرب کر رہی تھی کیونکہ کمنٹیٹر ہیجانی آواز میں چلا رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کہیں سعید انور تو آؤٹ نہیں ہو گیا۔

مگر تیسری رکعت میں اچانک سب کچھ بدل گیا۔ سب سے پہلے ٹی وی کی آواز موقوف ہوئی' جیسے کسی نے ٹی وی بند کر دیا۔ پھر نماز میں روانی آئی۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ میں نے سلام پھیرا ہے اور مغرب کے فرض کی نیت باندھ لی ہے۔ مجھے تو ہوش اس وقت آیا' جب میں نماز مکمل کر کے تسبیح کے بعد دعا کر رہا تھا۔

نماز پوری کر کے میں واپس آیا۔ "ٹی وی کیوں بند کر دیا تھا؟" میں نے چھوٹے بھائی سے پوچھا۔

"ٹی وی تو ایک سیکنڈ کے لئے بھی بند نہیں ہوا بھائی جان!" میرے بھائی نے کہا۔

مجھے حیرت ہوئی ..... مگر یہ جان کر میں اور حیران ہوا کہ میں نے صرف دو اوور مس کئے ہیں۔ اس وقت میں نے سوچا کہ آدمی کو نیکی' کوئی اچھا کام شروع میں وقت طلب بھی لگتا ہے اور وقت طلب بھی۔ اس لئے کہ نفس اس پر کڑھتا ہے مگر پھر اللہ اپنی نوازش سے اسے آسان اور تیز رفتار کر دیتا ہے۔ نیکی کا نقطہ آغاز سب سے مشکل ہوتا ہے پھر اللہ ہاتھ تھام لیتا ہے۔

مجھے احساس ہوا کہ یہ سب سوچنے کے دوران میں' میں روشنی کے بہت قریب پہنچ گیا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کوئی مقام خیر ہے۔ اس لئے تو شروع میں اتنا دشوار اور پہنچ سے دور لگ رہا تھا اور آخر میں' میں اتنی آسانی سے اس تک پہنچ گیا۔

میں نے اس کا جائزہ لیا۔ وہ بڑا سا ..... بہت وسیع و عریض کچا مکان تھا' جو اندھیرے میں گھرا ہوا تھا۔ روشنی بس دروازے بھر تھی۔ وہ لکڑی کا عام سا مگر کافی چوڑا دروازہ تھا جو کھلا ہوا تھا اس لئے روشنی باہر تک آ رہی تھی۔ ورنہ وہاں اندھیرا ہی ہوتا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا' پھر سامنے دیکھا۔ کہیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آگے سڑک پر بھی اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ گویا امان کی وہی ایک جگہ تھی .... اور گرد و پیش کے بارے میں تو مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کون سی جگہ ہے اور میں کہاں ہوں۔

میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا کچے مکان کے کھلے روشن دروازے کی طرف بڑھا۔ سچی بات یہ کہ مجھے ڈر بھی لگ رہا تھا۔ کون جانے یہ جس کا مکان ہے وہ کیسا ہو' کون ہو؟ مجھے تھوڑی دیر ٹھہرنے کی اجازت دے یا نہ دے۔ مکان کے مالک کے بارے میں مجھے طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ میں خوفزدہ ہو گیا لیکن جا کہیں نہیں سکتا تھا .... وہ مکان میری مجبوری تھا۔

میں نے دروازے پر کھڑے ہو کر پکارا۔ "کوئی ہے؟ کوئی ہے تو باہر آئے؟ میں راستہ بھٹک گیا ہوں۔" میں نے کئی بار پکارا لیکن جواب میں کوئی آہٹ تک نہیں ابھری۔ فضا کا سناٹا بتاتا تھا کہ وہاں کوئی نہیں ہے۔ پھر بھی میں نے احتیاطاً اور کئی بار پکارا۔ اس کے بعد ڈرتے ڈرتے دھڑکتے دل کے ساتھ کھلے دروازے سے گزر کر اندر داخل ہو گیا۔



میں کہانی کار ہوں۔ لفظوں سے کھیلتا ہوں۔ اظہار میرا کھیل ہے لیکن وہاں میں عاجز ہو گیا۔ اندر گھستے ہی جو کچھ میں نے دیکھا' اس طرح کی کوئی اور' عام سی اور دنیاوی صورت حال ہوتی تو میں بلا جھجک کہتا کہ اندر داخل ہوتے ہی جیسے جادو کے زور سے سب کچھ بدل گیا' لیکن یہ اظہار' یہ خیال میرے ذہن کو چھو بھی نہیں سکا۔ جادو تو بہت بری چیز ہوتی ہے جبکہ وہ سب بہت پاکیزہ' بہت اچھا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں گنگ ہو کر رہ گیا اور میں ساکت و صامت کھڑا اندر کا منظر دیکھتا رہا۔

وہ بہت بڑی' عظیم الشان اور پرشکوہ مسجد تھی اور پوری مسجد بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ اس خوبصورتی کو دیکھ کر میں یوں مبہوت ہوا کہ مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا۔ مجھے خیال بھی نہیں آیا کہ باہر میں نے کچا مکان دیکھا تھا۔ یہ اندر اتنی عظیم الشان مسجد کہاں سے آ گئی؟ اور وہ بھی اس سنسان سڑک پر ..... اس ویران علاقے میں۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میں کون ہوں اور کس حال میں' کس طرح یہاں پہنچا ہوں؟ میں تو بس اس کی خوبصورتی کو دیکھے جا رہا تھا۔

جہاں میں کھڑا تھا' وہاں جوتے اتارے جاتے تھے۔ بائیں جانب وضو خانہ تھا۔ اس کے پار بہت بڑا دالان تھا۔ دالان کے آگے مسجد کا بے حد وسیع و عریض ہال تھا۔ وضو خانے سے لے کر ہال تک درودیوار' فرش اور چھت ...... سب کچھ سنگ مرمر کا تھا۔ چھتوں سے بہت خوب صورت فانوس لٹکے ہوئے تھے اور اس مسجد کی فضا کیا بتاؤں ..... درودیوار کیا' وہاں ذرہ ذرہ ثنا خوانی کرتا محسوس ہو رہا تھا۔ میرے دل میں بے اختیار یہ خیال ابھرا کہ مجھے یہاں نماز پڑھنی چاہئے۔ یہاں نماز پڑھنے کا لطف ہی

کچھ اور ہے۔

میں نے چپلیں اتاریں اور وضو کرنے کے لئے جا بیٹھا۔ میں نے ٹونٹی گھمائی اور ہاتھ دھوئے۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ میں وضو کرنے کا طریقہ بھول گیا تھا۔ مجھے کچھ یاد ہی نہیں تھا۔ بے بسی کے احساس سے شل میں یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن ایسا لگتا تھا کہ میں نے زندگی میں کبھی وضو نہیں کیا ہے۔

میں یونہی ٹونٹی کھولے ہاتھوں پر پانی بہاتا رہا۔ آس پاس کوئی ہوتا تو اسے دیکھ کر ہی وضو کر لیتا۔ دل میں یہ خیال آتے ہی میں نے دالان کے اجتماع سے ایک شخص کو وضو خانے کی طرف آتے دیکھا۔ اس کی شخصیت بڑی بارعب تھی۔ کھچڑی بال' گھنی داڑھی' تندرست توانا جسم' چہرے کی سرخ و سپید رنگت۔ آنکھوں سے عمر زیادہ لگ رہی تھی مگر اس سے قطع نظر وہ دیکھنے میں چالیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔

وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر میری مخالف سمت وضو کرنے بیٹھ گیا۔ میں نے سکون کی سانس لی کہ اب میرا بھی وضو ہو جائے گا۔

وہ شخص اتنی آہستہ وضو کر رہا تھا کہ میرا کام اور آسان ہو گیا۔ لگتا تھا' وہ خود وضو نہیں کر رہا ہے' مجھے سکھا رہا ہے۔ اس کی رفتار ایسی تھی کہ میرا ہی وضو پہلے مکمل ہو گیا۔ میں اٹھنے لگا تو اس نے کہا۔ "سنو .... جاتے ہی سب سے پہلے دو نفل تحیتہ المسجد پڑھنا۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

اس نے مجھے تحیتہ المسجد کے بارے میں بتایا پھر بولا۔ "جس کے گھر بھی جاتے ہو' پہلے اسے تعظیم دیتے ہونا اور یہ تو پوری کائنات کے مالک کا گھر ہے۔"

"جی بہت بہتر" میں نے کہا اور چلنے لگا۔

"سنو!" اس نے پھر پکارا۔ "کثرت سے شکر کے نفل پڑھنا۔ یہ شکر کی رات ہے۔"

میں کہنا چاہتا تھا کہ یہ تو شب قدر ہے لیکن میں نے کہا نہیں۔ ظاہر ہے' وہ مجھ سے زیادہ جانتا ہو گا۔

"اور سورہ رحمٰن کی تلاوت ضرور کرنا۔ جو شخص سورہ رحمٰن کی تلاوت کرتا

ہے' وہ گویا اللہ کی ہر نعمت کا شکر ادا کرتا ہے۔"

"جی بہت بہتر۔"

مسجد کے ہال میں جا کر میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ سورہ رحمٰن کی تلاوت کے بعد میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ ایک جماعت ہال میں اور ایک جماعت باہر دالان میں ذکر و اذکار میں مشغول تھی۔ میں دالان میں آ گیا اور اس جماعت کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مجھے شامل ہوتے دیکھ کر جماعت کے ایک بزرگ نے بہ آواز بلند کئی بار الحمد للہ کہا۔ یہ گویا اعلان تھا کہ الحمد للہ کا ورد کیا جا رہا ہے۔ مجھے یہ بتانا مقصود تھا۔

ورد کے دوران میں جماعت میں شریک لوگوں کو دیکھتا بھی رہا۔ مجھ پر ہیبت طاری ہونے لگی۔ ایک سے بڑھ کر ایک نورانی چہرہ تھا کہ نگاہ تک نہیں ٹھہرتی تھی۔ انہی میں مجھے وہ چہرہ بھی نظر آیا جسے وضو کرتے دیکھ کر میں نے وضو کیا تھا۔ وہاں اب وہی ایک مجھے شناسا لگ رہا تھا۔ حالانکہ اس سے بھی میں مسجد میں داخل ہونے کے بعد ہی ملا تھا۔

ورد کا سلسلہ یونہی چلتا رہا اور اپنی کیفیت میں کیا بتاؤں۔ لگتا تھا کہ کسی نے اندر سے اچھی طرح دھو کر مجھے پاک کر دیا ہے۔ میں ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ سارے وجود میں کیف و انبساط جیسے موج در موج امنڈ رہا تھا۔ میں عجیب سرخوشی اور سرمستی کے عالم میں تھا۔

اچانک وہ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے' جنہیں دیکھ کر میں نے وضو کیا تھا اور اٹھتے اٹھتے انہوں نے مجھے اشارہ کیا۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دروازے سے گزرے اور باہر آ گئے۔

"جی فرمایئے؟" باہر آ کر میں نے ان سے کہا۔

"کچھ دیر ٹہلیں گے۔ ضروری بات کریں گے" انہوں نے جواب دیا۔

"لیکن میں ابھی وہاں رکنا چاہتا تھا" میرے لہجے میں ہلکا سا احتجاج تھا "زندگی میں پہلی بار مسجد میں ایسا دل لگا ہے میرا۔ نکلنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔"

"مگر اٹھنے کا حکم ہو گیا تھا برخوردار" انہوں نے مجھے مخاطب کیا جیسے میں ان سے بہت چھوٹا ہوں حالانکہ وہ میرے ہم عمر ہی لگتے تھے۔

"کیسا حکم .....؟" میں کہتے کہتے رک گیا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ حیرت سے میرا برا حال تھا "وہ .... وہ مسجد کہاں گئی؟"

"مسجد کہیں نہیں گئی۔ ہماری سعادت اتنی ہی تھی اس لئے اب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔"

"لیکن میں ......"

"میں نے کہا نا' ہماری سعادت اتنی ہی تھی اور یہ بھی اس کا کرم ہے ورنہ ہم اس قابل کہاں تھا" انہوں نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی "ہم خوش نصیب ہیں برخوردار۔"

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی ہے حالانکہ درحقیقت میں کچھ بھی نہیں سمجھا تھا۔

"اور تم ملال کیوں کرتے ہو' تم تو ....."

"جی ہاں۔ میں تو اتفاقاً راستہ بھٹک کر یہاں آ نکلا تھا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

انہوں نے کڑی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ان کی اس تہدیدی نگاہ کو دیکھتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ صبح کا اجالا رات کی تاریکی کو دھیرے دھیرے نگل رہا ہے "تمہاری بات صریحاً" غلط ہے" ان کے لہجے میں سنگینی تھی "تم راستہ بھٹک کر یہاں نہیں آئے۔ تمہاری زندگی گزر گئی راستہ بھٹکتے۔ آج پہلی بار صحیح راستے پر تمہارے قدم پڑے اور یہ اس کی عنایت ہے" انہوں نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی "اور تم یہاں اتفاقاً" بھی نہیں آئے۔ تمہیں بلایا گیا۔ تم پابند کر کے لائے گئے۔ تمہیں یہاں آنا ہی تھا۔"

"میں سمجھا نہیں' کس نے بلایا ہے مجھے؟"

"کون بلا سکتا ہے؟ جس کا گھر ہے' اس نے ہی بلایا تھا۔"

مفہوم سمجھ میں آیا تو مجھ پر لرزہ چڑھ گیا "مجھے! لیکن میں ..... میں تو گناہوں کی سیاہ دلدل میں سرتاپا غرق ...."

"اپنی باتیں وہ جانے" انہوں نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "اس

بے نیاز کو برائیوں کے اژدھام میں کسی کی کوئی خوبی پسند آ جائے تو وہ اسے دونوں جہان کی ہر نعمت سے نواز دے۔ وہ تو سب کچھ جانتا ہے نا۔"

"مگر مجھ میں تو کوئی خوبی ہے ہی نہیں" میں گڑگڑایا۔ میری کیفیت یہ تھی کہ میں خوف سے لرز رہا تھا اور شرمندگی سے پانی پانی ہوا جا رہا تھا۔

"وہ تمہیں جانتا ہے جبکہ تم خود سے بھی آگاہ نہیں" انہوں نے مجھے بہت غور سے دیکھا "ایک خوبی تو ہے تم میں۔"

"مجھے بھی بتایئے۔"

"میں کیا بتاؤں' ابھی منہ سے بول پڑے گی خود ہی۔"

"میں تو بہت گناہگار ہوں" مجھ پر رقت طاری ہونے لگی "اب یہی دیکھ لیں کہ یہ برکت کا مہینہ ہے اور میں نے ایک روزہ نہیں رکھا' آج جمعتہ الوداع کا بھی نہیں۔ ایک وقت نماز بھی نہیں پڑھی۔ اس وقت بھی بلاوا نہ ہوتا تو شاید یہاں بھی نہ آتا میں۔"

انہوں نے ملامت بھری نظروں سے مجھے دیکھا "کیوں ..... روزہ کیوں نہیں رکھتے ہو تم؟ بھوک برداشت نہیں ہوتی۔ پیاس سے گھبراتے ہو۔ ڈرتے بھی نہیں کہ اگر اس نے تم پر بھوک اور پیاس مسلط کر دی تو کیا کرو گے؟ روزے میں تو صبر وہی دیتا ہے لیکن بھوک کی سزا میں تم پر کیا گزرے گی۔"

میں تھرتھر کانپنے لگا "بددعا نہ دیں مجھے۔ اللہ اپنی خفگی سے امان میں رکھے مجھے۔ بات بھوک پیاس کی نہیں۔"

"تو پھر.....؟" انہوں نے مجھے گھورا۔

میں نے انہیں سگریٹ کی مجبوری کے متعلق بتایا۔

"اکل حلال تو بہت بڑی چیز ہے" انہوں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "ہاں' روزہ چھوڑنا بہت بڑا گناہ ہے لیکن اللہ بہت بخشنے والا بھی ہے اور قہار بھی ہے۔ فیصلہ تو وہی کرے گا" اچانک ان کا لہجہ بدل گیا۔ "مگر شاید یہ اس ملک کی خرابی ہے کہ یہ اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا اور اس کے باوجود یہاں کے باسی دین سے بے بہرہ ہو گئے۔ یہ ملک ہی خراب ہے۔"

مجھے اس بات پر شدت کا غصہ آیا کہ اپنی عاجزی ..... حتیٰ کہ اپنی گناہ گاری کو بھی بھول گیا۔ گرم خون جیسے چہرے کی طرف لپکا۔ مجھے یقین ہے کہ میرا چہرہ تمتما اٹھا ہو گا "بس ایک لفظ بھی نہ کہئے۔ میں اس معاملے میں بڑا بدلحاظ ہوں۔ وطن کی برائی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی" میں نے بے حد تند لہجے میں کہا۔

وہ میرے چہرے کو بہت غور سے دیکھتے رہے پھر مسکرا دیئے "لو دیکھ لو برخوردار۔ تمہاری ایک خوبی تو منہ سے بول اٹھی۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ کوئی چھوٹی خوبی نہیں کہ تم وطن سے محبت کرتے ہو۔"

"لیکن آپ تو....."

"تمہیں اکسانے کے لئے ..... یہ سب کہلوانے کے لئے کہی تھی وہ بات" انہوں نے بے حد حلیمی سے کہا "ورنہ یہ پاک وطن میرے لئے بھی بہت محترم ہے۔ وطن سے محبت تمہاری بہت بڑی خوبی ہے۔"

میں الجھنے لگا۔ کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن کچھ سوچ کر رہ گیا "مگر مجھے بلوایا کس لئے گیا تھا؟"

"کوئی کام لینا ہے تم سے۔"

میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا "کام! مجھ سے ... اللہ کو لینا ہے؟" میں حواس باختہ ہو رہا تھا۔

"اس کی مرضی۔ وہ تو ایسا نوازنے والا ہے کہ توفیق عطا کرتا ہے۔ دل میں خیال ڈالتا ہے۔ قوت عمل کو تحرک عطا فرماتا ہے۔ نیکی کے راستے کو آسان کرتا ہے۔ پھر بندہ جب وہ نیکی کرے تو دنیا میں اس کا اجر دیتا ہے ..... اور یہی نہیں' آخرت میں اس اجر کو ستر گنا بڑھا دیتا ہے۔ ایسا نوازنے والا ہے وہ۔"

"بے شک۔ لیکن میں اس کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار پیٹنے لگے "نعوذ باللہ..... توبہ توبہ کیا بکتے ہو؟" انہوں نے برہمی سے کہا "اسے کسی کی ضرورت نہیں۔ اس کے لئے کوئی کیا کرے گا۔ نعوذ باللہ ارے جو کرو گے' اپنے ہی لئے کرو گے اور لطف یہ کہ اس کی مزدوری

بھی ملے گی۔"

مجھ پر لرزہ چڑھ گیا۔ میں بھی دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار پیٹنے لگا "مم ..... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"خیر..... وہ تو دل کا حال بھی جانتا ہے لیکن تم مصنف ہو۔ لفظ تمہارا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ تمہیں لفظوں کے انتخاب میں غلطی نہیں کرنی چاہئے" وہ نرم لہجے میں بولے "شاید تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ میں تمہیں ایک واقعہ سناتا ہوں۔ پر یہ ذہن میں رکھنا کہ یہ سب کچھ اللہ کی دین ہے' اس کی طرف سے ہے اور سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں" اتنا کہہ کر انہوں نے گہری سانس لی اور کچھ سوچنے کے بعد بولے "ایک شخص تھا' جو بہت سخی تھا۔ اللہ نے دیا بھی بہت کچھ تھا۔ چنانچہ جسے مصیبت میں دیکھتا' اس کی مدد کرتا۔ ایک بار اس نے ایک ایسے شخص کو مفلوک الحالی میں دیکھا جسے اللہ نے معاشرے میں بڑی عزت دی تھی اور وہ بہت خوددار بھی تھا۔ سخی اس کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ وہ شخص احسان لینے والا نہیں۔ چنانچہ اس نے ایک ترکیب سوچی۔ اس کے پاس بہت بڑی لیکن بنجر زمین تھی' جس کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ وہاں پانی نہیں نکل سکتا۔ سخی اس شخص کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ وہ اس سے کنواں کھدوانا چاہتا ہے۔ اسے معقول مزدوری ملے گی۔ وہ شخص راضی ہو گیا۔ کنواں مکمل ہو گیا تو سخی نے کہا ..... افسوس' پانی نہیں نکلا۔ خیر' میرا نصیب۔ اس کنوئیں کو بھر دو۔ میں تمہیں اس کی مزدوری بھی دوں گا۔ اس سوکھے کنوئیں سے زمین بدنما لگنے لگی ہے۔ کنواں بھر گیا تو اس نے ضرورت مند سے ایک اور جگہ کنواں کھودنے کو کہا۔ مزدوری کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ سخی نے کہا' جب تک پانی نہیں نکلے گا' میں کنواں کھدواتا رہوں گا اور پانی نکل آیا تو تمہیں انعام بھی دوں گا۔ یوں سات کنوئیں کھدوائے اور بھرے گئے۔ ضرورت مند کا گھر عزت اور آبرو سے چلتا رہا۔ یہاں تک کہ اللہ نے خوش ہو کر پانی کو حکم دیا اور آٹھویں کنوئیں میں پانی نکل آیا۔ سخی نے بڑی عاجزی سے ضرورت مند کو انعام میں اتنا زر کثیر دیا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا اور اللہ نے سخی کو یہ اجر دیا کہ اس کی بنجر زمین لہلہا اٹھی۔" انہوں نے ایک گہری سانس لی اور چند لمحے بعد سلسلہ کلام جوڑا

"یہ اللہ کے ایک عام بندے کی سخاوت ہے تو اللہ کی سخاوت اور دین کا تو کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ بندے کی مدد کرنے' اس کے دین اور دنیا کے دلدر دور کرنے کی خاطر اس کے لئے کام نکالتا ہے۔ اسے کسی سے کوئی ضرورت نہیں' اسے کسی کی کوئی ضرورت نہیں۔"

انہوں نے وہ حکایت اتنے دل نشین انداز میں سنائی کہ اس کا مفہوم اور ماحصل میری روح کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ میرا حوصلہ دوچند ہو گیا کہ میرا رب اپنی کریمی سے میرے دلدر دور کرنے کا سامان فراہم کر رہا ہے۔ اس سے بڑی بشارت کیا ہو سکتی ہے۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر میں نے کہا "بات وہیں رہ گئی۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ مجھے کرنا کیا ہے؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم" وہ بولے "بابا عصر ہی بتائیں گے تمہیں۔"

"بابا عصر! یہ کون ہیں؟"

"بس میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ ایک بے حد برگزیدہ ہستی ہیں۔"

"وہ کب اور کہاں ملیں گے ہم سے؟"

"مجھے یہ بھی معلوم نہیں۔ بس ہمیں چل دینا چاہئے۔ ہمارے چلتے چلتے ہی وہ کہیں آ ملیں گے ہم سے۔"

میں نے اس جگہ کو دیکھا جہاں وہ کچا مکان تھا جس کے اندر وہ عظیم الشان مسجد تھی مگر اب وہاں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں ان صاحب کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

ہم چلتے رہے' اچانک ان صاحب نے کہا "کچھ بات تو کرو کہ سفر کٹے۔"

"مجھے اس مسجد کے بارے میں بتائیے؟" میں نے کہا۔

"مجھے خود بھی معلوم نہیں۔ میں یہاں پہلی بار آیا تھا ..... میرا مطلب ہے' بلایا گیا تھا۔"

"اور اس مسجد میں موجود لوگ؟"

"یہ عالم اسلام کا اجتماع عظیم تھا۔ یہ سب عالم اسلام کے چیدہ چیدہ لوگ تھے جو دنیا کے کونے کونے سے یہاں آ کر جمع ہوئے تھے" انہوں نے فخریہ لہجے میں کہا "تم

سوچ بھی نہیں سکتے کہ تم نے یہاں کس کس کو دیکھا ہے۔ اسی لئے تو کہتا ہوں کہ میرے اور تمہارے لئے اس مبارک رات اس اجتماع میں شمولیت ایک بہت بڑی سعادت ہے۔"

"جی بے شک" میں نے اثبات میں سرہلایا "یہ شب قدر ہے۔ میں جانتا ہوں مگر آپ نے فرمایا کہ یہ شکر کی رات ہے۔"

"ہاں' یہ شکر کی رات بھی ہے۔ شب قدر تو یہ ہے ہی مگر آج خاص طور پر شکر بھی ادا کرنا چاہئے۔"

"شکر تو ہر حال میں' ہر لمحے واجب ہے" میں نے کہا "مگر آج خاص طور پر کیوں؟"

"تمہیں نہیں معلوم؟" انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "تمہیں تو معلوم ہونا چاہئے' تم کیسے بے خبر ہو۔"

"مجھے نہیں معلوم" میں نے شرمندگی سے کہا۔

"پاکستان سے محبت کرتے ہو اور تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ آج پاکستان بنے پچاس سال ہو گئے۔"

میں ششدر رہ گیا۔ میں نے تیزی سے تاریخ' ماہ اور سال یاد کر کے ذہن میں دہرائے۔ تقریباً ڈیڑھ سال کا فرق تھا۔

"کیوں؟ سمجھ میں نہیں آئی میری بات؟" انہوں نے پوچھا۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟" میں نے جلدی سے کہا "آپ حساب لگائیں۔ اگر آج پچاسواں یوم آزادی ہوتا تو ہر طرف جشن کا سماں ہوتا۔ ریڈیو اور ٹی وی پر اس سلسلے میں خصوصی پروگرام چل رہے ہوتے۔ دیکھیں نا' پاکستان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو بنا تھا ..... اور آج ۱۶ فروری ۱۹۹۶ء ہے۔"

"یہی تو المیہ ہے" انہوں نے ملامت بھرے لہجے میں کہا "۱۴ اگست کو تم لوگوں نے حرز جاں بنا لیا ..... اور ناقابل فراموش ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ کو بھول گئے۔ اب ذرا خود حساب لگا لو۔ پچاس سال ہوئے کہ نہیں؟"

"میں تو یہ سمجھا تھا کہ ..... دراصل یہاں تاریخ پیدائش یاد نہیں رکھی جاتی لیکن

جب سکول میں داخلے کے وقت پوچھی جائے تو سب اپنے بچوں کی تاریخ پیدائش ۲۳ مارچ' ۱۴ اگست یا ۲۵ دسمبر لکھوا دیتے ہیں۔ میں سمجھا شاید یہ بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔ مشہور کر دیا گیا کہ پاکستان ۲۷ رمضان المبارک کو بنا تھا۔"

"نہیں۔ میں خود اس کا گواہ ہوں۔ رات بارہ بجے ریڈیو پاکستان نے پہلا اناؤنسمنٹ کیا تو وہ رمضان کی ۲۷ ویں شب تھی۔"

میرا وجود خوشی سے بھر گیا۔ پاکستان .... میرا محبوب وطن پچاس سال کا ہو گیا۔ شکر میرے دل کی پاکیزہ ترین گہرائی سے ابھر کر لبوں پر آیا اور میرا گمان ہے کہ اللہ کی بارگاہ کی طرف پرواز کر گیا۔ وہ میرے لئے بڑی طمانیت کا لمحہ تھا "تو مسجد میں یہ اجتماع اس سلسلے میں شکر ادا کرنے کے لئے ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ پاکستان کے قیام پر تو شکر ادا کیا جاتا رہا ہے۔ یہ قیام پاکستان کے پچاس سال گزرنے پر خصوصی شکر کی رات تھی۔"

"شکر ادا کیا جاتا رہا ہے؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں' دنیا بھر کے مسلمان قیام پاکستان پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور استحکام پاکستان کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔" انہوں نے کہا۔

"لیکن میں نے تو یہی دیکھا کہ دو ایک اسلامی ملکوں کو چھوڑ کر تمام اسلامی ممالک کے بھارت سے زیادہ اچھے تعلقات ہیں" میں نے دل گرفتہ لہجے میں اعتراض کیا "کوئی مسئلہ ہو بین الاقوامی فورم پر یا تجارت' ہمیشہ پاکستان پر بھارت کو ترجیح دی جاتی ہے۔"

"یہ تو حکمرانوں کا رویہ ہے۔ سچے دردمند مسلمان اور علماء و فقہا پاکستان سے محبت کرتے ہیں۔ اب آج ہی دیکھ لو' تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ مسجد میں موجود لوگوں میں سے کون کہاں سے کتنی زحمت کر کے آیا ہے اور یہ سب نہ سرکاری طور پر آئے ہیں' نہ یہاں سرکاری مہمان کی حیثیت ہے ان کی۔"

"یہی تو مجھے حیرت ہے۔ پاکستان کو اتنی اہمیت......"

میں اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ عقب سے کسی نے بھاری' گونج دار اور بارعب آواز میں میری بات کاٹ دی۔ "یہی تو رونا ہے۔ پاکستان کی اہمیت کوئی پاکستانی نہیں

سمجھتا۔ تم جیسے لوگ جو پاکستان سے عشق کرتے ہیں‘ وہ بھی پاکستان کی اہمیت سے بے خبر ہیں۔"

یہ آواز سنتے ہی میں نے پلٹ کر دیکھا۔ آواز ذرا فاصلے سے آتی محسوس ہوئی تھی مگر میں نے پلٹ کر دیکھا تو اس دوران میں مخاطب میرے برابر آ چکا تھا۔ میں نے دوبارہ سر گھمایا تو وہ مجھ سے اک قدم آگے تھا۔ اس کی رفتار پر مجھے حیرت ہونے لگی۔

میرے ساتھی نے خوش ہو کر چہکتی آواز میں کہا "لو.... بابا عصر آ گئے۔"

میں بابا عصر کو ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا تھا اور اب ان کی پشت میرے سامنے تھی۔ ان کے بڑے بڑے برف جیسے سفید بال کندھوں پر پڑے نظر آ رہے تھے اتنے سفید بالوں کے ساتھ میں تو بس جھکی ہوئی کمر کا ہی تصور کر سکتا ہوں لیکن وہ تیر کی طرح سیدھے اور دبلے پتلے تھے۔ ان کی رفتار ان کے پھرتیلے پن کی گواہی دے رہی تھی۔

"ذرا قدم تیز کرو برخوردار آفاق!" میرے رفیق نے مجھ سے کہا "بابا عصر رک کر بات نہیں کرتے۔ سب کچھ چلتے چلتے ہی ہو گا۔"

میں نے قدم تیز کئے اور بابا عصر کو سلام کیا۔ انہوں نے چلتے چلتے ہی مصافحہ کیا۔ میں چلتے چلتے انہیں غور سے دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جو کچھ میں نے دیکھا‘ وہ بے حد متاثر کن تھا۔ ان کے صرف بال ہی نہیں‘ بھنوئیں بلکہ پلکیں تک سفید تھیں۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ عمر کے اعتبار سے وہ ضعیف ہیں لیکن سن کی سفیدی کے سوا باقی ہر چیز اس کی تردید کر رہی تھی۔ ان کا چہرہ جھریوں سے پاک تھا۔ اس پر بچوں کی سی معصومیت تھی۔ چہرے کی جلد شفاف اور بے داغ تھی۔ ان کی آنکھیں ایسی چمکدار تھیں کہ ان سے زیادہ دیر تک نظر ملانا ناممکن لگتا تھا لیکن میں نہ جانے کیوں ان کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ چند لمحے بعد ان کی آنکھوں سے نرماہٹ جھلکنے لگی۔ تب میں نے دیکھا کہ بالوں کی طرح آنکھیں بھی ان کی طویل العمری کی غمازی کر رہی ہیں۔ ان میں مشاہدے اور تجربے کی گہرائی تھی۔ مجموعی طور پر وہ بارعب شخصیت کے مالک تھے۔

وہ مسکرائے "آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا آتا ہے تمہیں؟" انہوں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

مگر ان کے لفظوں نے مجھے گڑبڑا دیا۔ میں ان سے بہت زیادہ مرعوب ہو چکا تھا‘ "میں اس غیر ارادی گستاخی پر معافی چاہتا ہوں۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

ان کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی "یہ گستاخی بالارادہ کرو تو زیادہ بہتر ہو گا۔"

میں ڈرا کہ شاید وہ مجھ پر طنز کر رہے ہیں "میں اتنا گستاخ بھی نہیں۔"

"یہ بات نہیں" انہوں نے نرم لہجے میں کہا "مجھے وہ لوگ اچھے لگتے ہیں جو میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھیں۔ وہ کامیاب رہتے ہیں۔ میں ان کے لئے نرم ہو جاتا ہوں" وہ کہتے کہتے خاموش ہوئے پھر بولے "اور تم مجھے اتنے غور سے کیوں دیکھ رہے ہو۔ میرا چہرہ یاد رکھ کر تم آئندہ بھی پہچان نہیں سکو گے۔ بنانے والے نے مجھے ایسے لچک دار خدوخال دیئے ہیں کہ ایک معمولی سی جنبش سے میرا چہرہ یکسر تبدیل ہو جاتا ہے۔ لو دیکھو ....." انہوں نے بھنویں ذرا اوپر اٹھائیں‘ میں حیران رہ گیا۔ واقعی وہ چہرہ بالکل بدل گیا تھا‘ میری پہچان اور ہے .... میری چال‘ میری رفتار۔ چہرے پر نہ جاؤ۔"

میں اور زیادہ مرعوب ہو گیا "بڑی خوشی ہوئی ہے آپ سے مل کر۔ آپ نے ایک بات کہی تھی ...."

"سب باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی" بابا عصر نے خشک لہجے میں کہا "پہلے کام کی بات ہو گی۔ تمہارے لئے ایک کام کا حکم آیا ہے اس لئے تمہیں بلایا گیا ہے۔"

"اور میں اس پر حیران ہوں" میں نے کہا "میں تو کسی کام کا بھی نہیں ہوں۔ بے عمل اور نام کا مسلمان ہوں میں۔"

"اوپر والے کا اختیار تو جانتے ہو۔ وہ جب جسے چاہے ہدایت دے اور جب جسے چاہے گمراہ کر دے۔"

"مگر میں نکما ناکارہ انسان۔ مجھ میں تو کوئی خوبی بھی نہیں۔"

"ایک خوبی ہے ..... پاکستان سے سچی محبت۔"

"یہی انہوں نے کہا تھا" میں نے اپنے رفیق کی طرف اشارہ کیا "لیکن میں اس

کی اہمیت ....."

بابا عصر نے میری بات کاٹ دی "یہ سب بعد میں سمجھایا جائے گا۔ پہلے یہ بتاؤ' کوئی ہنر ہے تمہارے پاس۔ اللہ نے کوئی بڑی طاقت دی ہے تمہیں۔"

"میں نے عرض کیا نا' میں بالکل بے کار آدمی ہوں۔"

"بے خبر' ناشکرے" بابا عصر نے گرج کر کہا "اللہ نے قلم نہیں دیا تجھے جو بہت بڑی طاقت ہے۔ اللہ نے لفظ نہیں دیئے تجھے' جو بہت بڑی نعمت ہیں اور اس نے لفظوں کو استعمال کرنے اور برتنے کا سلیقہ نہیں دیا تجھے' جو بہت بڑا ہنر ہے۔ تیرے لفظوں کو تاثیر نہیں دی اس نے؟"

مجھ پر کپکپی چڑھ گئی "جی ..... مجھے خیال نہیں رہا ....."

"خیال اسی لئے نہیں رہا کہ تو نے کبھی ان کی اہمیت اور افادیت نہیں سمجھی"

بابا عصر اب بھی غصے میں تھے "قلم کو طاقت' لفظوں کو نعمت اور لکھنے کی صلاحیت کو ہنر نہیں سمجھا اور جب آدمی نعمت کو نعمت نہیں سمجھے گا تو کفران نعمت تو کرے گا ہی' اسی لئے تو سب کچھ رائیگاں کرتا رہا۔ یاد رکھ' ناشکرا پن نعمت سے بے خبری کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔"

"بابا' اللہ کا شکر ہے۔ میں نے ناشکرا پن کبھی نہیں کیا۔"

"میری بات غور سے نہیں سنی تو نے۔ جب نعمت ملے' مگر آدمی اس سے بے خبر ہو تو وہ شکر کیسے ادا کرے گا۔ سب سے اچھا شکر تو بہترین استفادہ ہے اور یہی شکر گزاری ہے اور یہ گمان بھی نہ کرنا کہ یہ تو اللہ کے لئے کر رہا ہے۔ یہ تو اپنے لئے کر رہا ہو گا۔ اللہ جسے چاہے' ہدایت دے سکتا ہے۔ تجھے وسیلہ بننے کی سعادت مل رہی ہے تو اس سے استفادہ کر۔"

"میں سمجھ گیا لیکن مجھے لکھنا کیا ہے؟" میں نے بے حد عاجزی سے کہا۔

"جو میں بتاتا رہوں' وہ لکھ۔ میں تجھے مختلف ادوار میں مسلمانوں کے عروج و زوال کے متعلق بتاؤں گا' مکمل پس منظر فراہم کروں گا۔"

"یعنی مجھے تاریخ لکھنی ہو گی؟" میں نے مایوسی سے کہا۔

"نہیں۔ تاریخ تو بادشاہ لکھواتے ہیں اور وہ عموماً جھوٹی ہوتی ہے۔ دباؤ کے

تحت لکھی جاتی ہے' اگر بادشاہ زندہ ہو' اور وہ مرجائے تو نفرت اور تعصب کے تحت بدلے اتارنے کے لئے لکھی جاتی ہے۔ تجھے تو وہی لکھنا ہے جو تو لکھتا ہے۔ تجھے کہانی لکھنی ہے لیکن اس میں اچھی تلقین اور ترغیب شامل کرنی ہے۔ تجھے اس کہانی میں لوگوں کو آگہی دینی ہے۔ پاکستان سے محبت کا پرچار کرنا ہے۔"

"جی ..... میں تیار ہوں۔ آپ مجھے پاکستان کی اہمیت کے متعلق بتائیے۔"

"آج نہیں۔ کل بتاؤں گا۔" بابا عصر نے کہا۔ "آج کے بعد ہر روز تم رات کے کھانے کے بعد ٹہلنے نکلو گے۔ میں تم سے ملوں گا اور تمہیں سب کچھ بتاتا' سمجھاتا رہوں گا۔ وہ بے ترتیب ہو گا۔ اسے ترتیب دینا تمہارا کام ہے۔ وہ بیک گراؤنڈ میٹرل ہو گا۔ اسے کہانی میں استعمال کرنا تمہارا کام ہو گا۔"

میں گھبرا گیا "آپ یونہی چلتے پھرتے بتایا کریں گے مجھے؟"

"ہاں' میں رکتا نہیں۔ رک ہی نہیں سکتا۔"

"تو پھر آپ کی کوئی بات مجھے یاد نہیں رہے گی' یہ میری کمزوری ہے۔"

انہوں نے میری آنکھوں میں دیکھا "میری کہی کوئی بات تم انشاء اللہ کبھی نہیں بھولو گے۔ لکھنے بیٹھو گے تو سب یاد آ جائے گا۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ نگاہوں کے سامنے نظر آ جائے اور ہاں ذرا تیز چلنے کی عادت ڈالو۔ تمہاری خاطر آہستہ چلنے کی وجہ سے میں تھک گیا ہوں۔"

مجھے حیرت ہوئی کیونکہ میرے تو ہانپنے کی نوبت آ گئی تھی۔

"ایک کام اور ہے۔ وہ حارث بن عثمان تمہیں بتائیں گے" بابا عصر نے میرے رفیق کی طرف اشارہ کیا "اب میں چلتا ہوں۔" یہ کہتے ہی ان کی رفتار تیز ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

میں نے گہری سانس لے کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھا "تو آپ حارث بن عثمان ہیں؟"

"ہاں" انہوں نے کہا پھر بولے "چائے کی طلب ہو رہی ہے؟ چلو تمہیں چائے پلا دوں؟"

"چائے ..... یہاں؟" میں نے حیرت سے کہا لیکن سر گھما کر دیکھا تو اور حیران ہو

گیا۔ اس وقت میں اپنے علاقے کے بازار والی سڑک پر تھا۔ سامنے وہ ریسٹورنٹ تھا جو رمضان میں افطار سے لے کر ختم سحر تک کھلا رہتا تھا۔

"آؤ میرے ساتھ ...." حارث بن عثمان نے میرا ہاتھ تھام کر کہا اور ریسٹورنٹ کی طرف بڑھ گئے۔

ہم نے چائے کے ساتھ ایک ایک پراٹھا کھایا۔ حارث بن عثمان نے بیرے سے مزید چائے لانے کو کہا اور مسکرا کر مجھ سے بولے۔ "اصل چائے تو اب پئیں گے۔ وہ چائے تو پراٹھا پی گیا۔"

اس انداز بیان پر میں بھی مسکرا دیا۔ میں نے ریسٹورنٹ کی گھڑی میں وقت دیکھا۔ صبح کے چار بجے تھے۔ اس وقت بیرا چائے کی دو پیالیاں رکھ گیا۔ میں نے گرما گرم بھاپ اڑاتی چائے کا ایک گھونٹ لیا اور جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ مجھے اس پر حیرت ہو رہی تھی کہ چھ گھنٹے سے مجھے سگریٹ کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ میں نے بے تابی سے سگریٹ نکال کر جلائی اور ایک گہرا کش لیا۔ دھوئیں کے مرغولے بناتے ہوئے میں نے حارث بن عثمان سے کہا۔ "اب تجسس میری برداشت سے باہر ہو گیا ہے۔"

"کس سلسلے میں؟" حارث بن عثمان نے پوچھا۔

"بہت سلسلے ہیں" میں نے گہری سانس لے کر کہا "پہلے آپ اپنا تعارف کرائیں۔ آخر آپ میری اس کہانی کا بے حد اہم کردار ہیں۔ پھر مجھے یہ بھی بتائیں کہ آج جو میرے ساتھ ہوا' یہ سب کیا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ آپ کو مجھے ایک کام بھی سونپنا ہے۔"

"میرا تعارف تو ایسا کوئی خاص نہیں۔ تم جان چکے ہو کہ میرا نام حارث بن عثمان ہے۔ اب یہ بتا دوں کہ میں مہاجر ہوں ....."

میں نے گرم جوشی سے ان کا ہاتھ تھام لیا "واہ' بہت خوب۔ میں بھی مہاجر ہوں۔"

انہوں نے سرد مہری سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور مجھے ملامت بھری نظروں سے دیکھا

"تم ..... تم مہاجر کیسے ہو سکتے ہو؟" ان کے لہجے میں ہلکی سی برہمی تھی۔

"حیرت ہے۔ آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔ بھئی میرے والدین ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے تھے۔"

"اور تم یہاں پیدا ہوئے؟"

"جی ہاں ..... ۱۹۵۶ء میں۔"

"یعنی پاکستان بننے کے نو سال بعد .... پاکستان میں۔" ان کے لہجے میں کاٹ تھی۔

"جج ..... جی ہاں" نہ جانے کیوں میں شرمندگی محسوس کرنے لگا۔

"کوئی ..... جہاں، اپنے گھر میں، حالت قیام میں پیدا ہوا ہو، وہاں مہاجر کیسے ہو سکتا ہے؟" حارث بن عثمان نے کہا "اور اللہ تعالٰی نے مہاجر کی تعریف یہ کی ہے .... سو وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی، نکالے گئے اپنے گھروں سے اور ستائے گئے میری راہ میں۔ مہاجر ہونا کوئی نسل در نسل منتقل ہونے والی وراثت تو نہیں۔ اس کا انحصار تو پرفارم کرنے پر ہے۔ جس نے ہجرت کی، وہ مہاجر ہے۔ تم ناشکرا پن کیوں کرتے ہو؟"

"جی، ٹھیک ہے۔ آپ نے درست فرمایا۔ میں تو آزاد سرزمین پر پیدا ہوا۔ میں تو پاکستانی ہوں" میں نے سر جھکا کر کہا "آپ اپنے بارے میں بتا رہے تھے۔"

"میں فلسطینی ہوں" انہوں نے سرد آہ بھر کے کہا "۱۳۶۶ھ کی شب برات کے موقع پر میں وہاں ایسی ہی ایک مسجد میں تھا ..... آج کی طرح۔ وہاں بڑی بڑی ہستیاں موجود تھیں۔ پاکستان اس کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد قائم ہوا لیکن یقین کرو، وہاں پاکستان کے قیام کے لئے گڑگڑا کر دعائیں کی جا رہی تھیں۔ اس کے استحکام، اس کے لئے خیر و برکت کی دعا کی جا رہی تھی۔ میں نے حیران ہو کر ایک بزرگ سے استفسار کیا۔ انہوں نے بتایا کہ انشاء اللہ دنیا کے نقشے پر ایک نیا اسلامی ملک ابھرنے والا ہے۔ یہ بڑا عظیم ملک ہو گا جیسے سرزمین عرب اسلام کا روحانی مرکز ہے اور قیامت تک رہے گا، ویسے ہی یہ دنیا ملک اسلام کا عسکری مرکز ہو گا۔ یہ اسلام کا قلعہ اور مسلمانوں کی طاقت کا مرکز ہو گا۔ مسلمان دنیا کے کسی گوشے میں بھی ہوں، یہ ان کے تحفظ کی علامت ہو گا۔ طاغوتی طاقتیں جب کمزور مسلمانوں کو کچل رہی ہوں گی تو یہ ان کی داد

رسی کے لئے خود کو تیار کر رہا ہو گا۔ جب احیائے اسلام کی تحریک شروع ہو گی، حق و باطل آخری معرکے کے لئے صف آرا ہوں گے تو یہی ملک سب سے آگے ہو گا۔ یہی جذبہ جہاد میں نئی روح پھونکے گا۔ یہی حق کی فتح میں کلیدی کردار ادا کرے گا" وہ کہتے کہتے رکے اور انہوں نے گہری سانس لی پھر انہوں نے سلسلہ کلام جوڑا "مجھے اسی لمحے اس ان دیکھی سرزمین سے عشق ہوگیا جسے اللہ جل شانہ نے اتنی سعادتیں بخشنے کا فیصلہ کیا تھا۔"

"پھر آپ یہاں آ گئے؟"

"نہیں۔ ایسے کوئی آ سکتا ہے۔ اشتیاق کتنا ہی ہو پھر یہ ہوا کہ یہودی غاصب آئے اور فلسطین پر چھا گئے۔ ہم سے ہماری زمینیں چھین لی گئیں۔ ہم گھر سے بے گھر ہو گئے۔ ہم اللہ کی راہ میں ستائے جانے لگے۔ ہمیں کبھی حیلوں بہانوں سے اور کبھی کھلم کھلا نماز سے روکا جانے لگا۔ ظلم و ستم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں نے تاریخ کی روشنی میں سمجھ لیا کہ ہجرت کا وقت آ گیا ہے۔ مگر سوال یہ تھا کہ میں کہاں جاؤں۔ اچانک ایک نام کی پکار میرے اندر ابھری اور میرا پورا وجود جیسے روشن ہو گیا ..... پاکستان! پوری دنیا کے مسلمانوں کے تحفظ کی علامت۔ تمام مسلمانوں کی داد رسی کا .... اسلام کی طاقت کا مرکز۔ سو میں جوش و جذبے سے بھرا پاکستان چلا آیا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟ اور اس وقت آپ کی عمر کیا تھی؟"

"میں ۱۳۷۱ھ میں یہاں آیا۔ اس وقت میری عمر ۲۲ سال تھی۔"

میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ میں دل ہی دل میں حساب لگاتا رہا پھر بولا "تو اب آپ کی عمر ۶۵ سال سے زیادہ ہے۔"

"ہاں۔" حارث بن عثمان مسکرائے "مجھے ۴۵ سال ہو گئے یہاں آئے۔"

آپ کی اتنی عمر لگتی نہیں۔ پھر آپ واپس نہیں گئے؟"

"نہیں۔ میں یہیں کا ہو گیا۔ پاکستان سے محبت مجھے پہلے ہی سے تھی۔ اب تو میں پاکستانی ہوں اور مجھے اس پر فخر ہے۔"

"آپ کو اپنی زمین، اپنا وطن یاد نہیں آتا؟"

"جس سرزمین پر برائیاں پھیلنے لگیں، ظلم حد سے گزر جائے، اللہ کے احکامات

کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہونے لگے اور نیکی کی گنجائش نہ رہے اور آپ میں اصلاح احوال کی طاقت نہ ہو تو ہجرت کرلینی چاہئے اور زمین کی محبت یہ ہے کہ وہاں اس وقت تک واپس نہ جاؤ' جب تک تم میں بدی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی اور ظلم کا سر کچلنے کی طاقت نہ آ جائے۔ میں بھی اسی طاقت کا منتظر ہوں۔ انشاء اللہ ایک دن اپنے وطن بھی جاؤں گا۔"

میرا دل خوبصورت مگر ان جانے جذبوں سے بھر گیا۔ عجیب باتیں کرتے تھے حارث بن عثمان۔ جو کچھ اندر...... بہت اندر تھا لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا' وہ بھی سمجھ میں آنے لگتا۔ اللہ کے احکامات کے تحت زندگی گزارنے کے طور طریقے' آداب اور قرینے سمجھ میں آنے لگتے تھے لیکن وہ سب بہت دور کی باتیں لگتی تھیں۔

"اندر اندھیرا بہت گہرا ہو تو ایسا ہی لگتا ہے" حارث بن عثمان نے میری سوچ پڑھ لی۔

"یہاں آپ رہتے کہاں ہیں؟"

"ایک مسجد میں شب بسری کرتا ہوں۔ وہاں اذان دینا' مسجد کی دھلائی صفائی میرے ذمے ہے" انہوں نے میری نگاہوں میں کچھ دیکھا تو جلدی سے وضاحت کی "اس کا محنتانہ نہیں لیتا میں۔ فجر کی نماز کے بعد مسجد سے نکل آتا ہوں۔ مزدوری تلاش کرتا ہوں۔ کچھ کرنے میں عار نہیں سمجھتا۔ بوجھ بھی ڈھو لیتا ہوں۔ گڑھا بھی کھود لیتا ہوں۔ محنت کا کوئی کام بھی ہو' اجرت پر بھی بحث نہیں کرتا۔ دو وقت پیٹ بھرنے ہی کا تو مسئلہ ہے۔ وہ بھی کیا مسئلہ ہے۔ فاقے میں بھی کوئی حرج نہیں لیکن ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ بازار کے سب دکان دار مجھے جانتے ہیں۔ روز کوئی نہ کوئی کام مل جاتا ہے۔ تن ڈھانپنے کے لئے سال میں دو جوڑے بہت ہیں۔ ان کا بھی سامان میرا رزق دینے والا میری محنت کے بہانے کر دیتا ہے۔ ایک جوڑا جمعتہ الوداع کے لئے اور دوسرا عید کے لئے۔"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دل ایک دم بھر آیا کہ زندگی یوں بھی ہوتی ہے۔

حارث بن عثمان میرے آنسو دیکھ کر بھڑک گئے "تم مجھ پر ترس کھاتے ہو اور

مجھے تم پر ترس آتا ہے" انہوں نے برہمی سے کہا "میں کپڑوں کی آرزو نہیں کرتا۔ میرا رب دے دیتا ہے تو میں خوشی اور شکرگزاری سے روتا ہوں۔ تم کپڑوں کی فکر میں ہلکان ہوتے ہو۔ نہ ملیں تو اندر سے شکوہ کرتے اور دکھ سے روتے ہو۔ زندگی یہی ہے کہ میں سوکھی روٹی مل جانے پر شکر ادا کرتا ہوں کہ اللہ نے فاقے سے بچا لیا۔ زندگی یہ نہیں کہ تم دو دن بگھاری ہوئی دال سے تازہ' نرم روٹی بے دلی سے کھا کر روتے اور شکوہ کرتے ہو کہ اے اللہ' تو نے ہمارے نصیب میں صرف دال ہی لکھ دی ہے' یہ کیا ظلم ہے۔"

کیسی سچی بات تھی۔ مجھ پر اللہ کا ایسا خوف طاری ہوا کہ میں تھر تھر کانپنے لگا۔ میں نے دل میں اللہ سے توبہ کی۔ اس لمحے میں اپنی ہر پریشانی بھول گیا تھا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں" میں نے کہا "زندگی وہ نہیں' جو ہم گزار رہے ہیں۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ میں حارث بن عثمان کے بارے میں سوچتا رہا۔ اچانک مجھے کچھ خیال آیا اور میں نے ان سے پوچھا۔ "آپ کے بھائی بہن اور رشتے دار تو ہوں گے۔ کیا وہ فلسطین میں ہی ہیں؟"

"اگر میں جواب اس انداز میں دوں کہ کروڑوں کلمہ گو بھائیوں کے سوا دنیا میں میرا کوئی نہیں تو یہ بہت بڑی ناشکری ہو گی۔ جہاں تک خونی رشتوں کا تعلق ہے تو....." انہوں نے ایک سرد آہ بھری "میرے والدین' آٹھ بہن بھائی اور چار چچا' سب یہودیوں کے پھینکے ہوئے ایک بم کی نذر ہو گئے۔ سب شہید ہو گئے۔ ایک میں ہی بدنصیب' خوش نصیب بچا۔ سو میں ہجرت کر آیا۔"

"یہ بدنصیب' خوش نصیب کا کیا مطلب ہوا؟"

"ایسا خوش نصیب جو درحقیقت بدنصیب ہے۔"

"جان بچنا بدنصیبی تو نہیں ہوتی۔ یہ ناشکرا پن نہیں ہے؟"

"جان بچنا خوش نصیبی ہے لیکن موقع ہوتے ہوئے شہادت کا نہ ملنا اس سے بڑی بدنصیبی ہے اسی لئے میں خود کو ایسا خوش نصیب سمجھتا ہوں' جس کی بدنصیبی اس کی خوش نصیبی سے بڑی ہے۔"

"آپ مسجد میں رہتے ہیں۔ آپ کے بیوی بچے....."

"میں نے شادی ہی نہیں کی۔ اس طرز زندگی میں شادی نہ کرنا ہی بہتر تھا اور یقین کرو، میں ہمیشہ خوش رہا۔"

اس بار ان کی عید کا تصور کر کے میری آنکھیں بھیگنے لگیں۔ نہ گھر، نہ بیوی بچے، نہ کوئی اپنا اور وطن سے دور! "آپ عید کے دن کیا کرتے ہیں؟"

"اتنے لوگوں سے عید ملتا ہوں کہ کوئی نہیں ملتا ہوگا" انہوں نے فخریہ لہجے میں کہا "پہلے اپنی مسجد میں ہر شخص سے عید ملتا ہوں پھر باہر نکل آتا ہوں۔ بازار سے گزرتے ہوئے ہر جاننے والے، ہر اجنبی سے عید ملتا ہوں۔ پھر آگے ہی آگے چلتا جاتا ہوں۔ جو نظر آ جائے، اس سے عید ملتا ہوں، چلتا جاتا ہوں ..... آگے ہی آگے ..... لوگوں سے عید ملتا ہوں۔ مجھے اس سے غرض نہیں ہوتی کہ وہ کون سی بستی، کون سا علاقہ ہے۔ عصر پڑھ کر واپس چلنا شروع کرتا ہوں اور اگلے دن سے پھر معمول شروع۔"

میرا دل اور بھر آیا "میری ایک بات مانیں گے۔"

"کہو، کوشش کروں گا کہ مان لوں۔"

"آپ میرے گھر کو اپنا گھر سمجھ لیں۔ میرے ساتھ رہیں۔ میرے بیوی بچے آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

"برخوردار ..... تم نے جس خلوص اور محبت سے یہ بات کہی ہے، اسے ٹالنا نہیں چاہئے لیکن خود سوچو، اللہ کے گھر کی مہمانی کی سعادت سے منہ موڑ کر کیسے آ سکتا ہوں۔"

بات ایسی تھی ..... اور انہوں نے ایسے لہجے میں کہی تھی کہ میں اصرار نہ کر سکا پھر بھی میں نے کہا "تو ٹھیک ہے۔ آپ عید تک تو میرے ساتھ رہ سکتے ہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ میں تمہاری بات ٹال کر تمہارے خلوص کی توہین نہیں کرنا چاہتا۔" انہوں نے کہا پھر گہری سانس لے کر بولے۔

"اپنے بارے میں، میں نے بتا دیا۔ اب آگے چلو۔ آج جو کچھ ہوا، تم جان چکے کہ تمہیں کس لئے بلایا گیا تھا۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ اب اس مسجد کا سن لو۔ وہاں شکر ادا کرنے والوں میں شہدا بھی تھے اور اللہ کے مقرب

صالحین بھی۔ اور وہاں کون کون سی بڑی ہستیاں تھیں، یہ میں بھی نہیں جانتا۔ میں ایک عام انسان ہوں ... اور عام انسانوں سے زیادہ گناہ گار۔ اللہ کا کام ہے کہ مجھے وہاں حاضری کی سعادت ملی۔ ہاں، میں یہ جانتا ہوں کہ ایسے اجتماع ہوتے رہتے ہیں اور وہی اس ملک میں خیر و برکت کا باعث ہیں۔"

"اور آپ کو مجھے کون سا کام سونپنا ہے؟"

انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا اور پھر انہوں نے بند مٹھی میرے سامنے کھول دی۔

میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔

میں نے اشرفیوں کے متعلق سنا تھا، پڑھا تھا لیکن اشرفیاں دیکھی کبھی نہیں تھیں۔ پھر بھی میں نے دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ وہ اشرفیاں ہیں۔ میں سحر زدہ سا انہیں دیکھتا رہا لیکن چند لمحے بعد مجھے شبہ ہونے لگا کہ وہ اشرفیاں نہیں ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اشرفیاں سونے کی ہوتی ہیں۔ ابتدا میں وہ مجھے طلائی رنگ کی لگیں مگر پھر مجھے احساس ہوا کہ ان کی رنگت اس دنیا کی چیز تو نہیں ہے۔ یہ نہیں کہ وہ رنگت بدل رہی ہوں۔۔۔ یا ان میں سے مختلف رنگوں کی شعاعیں پھوٹ رہی ہوں۔ ان کا ایک ہی رنگ تھا۔ دنیا میں جو رنگ ہوتے ہیں، ان کے حساب سے وہ سنہرے رنگ سے قریب نہ تھا لیکن میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ سنہرا رنگ نہیں تھا۔ ان میں اندر جو شیڈ جھلملا رہے تھے، وہ بھی سنہرا رنگ ہی کے تھے۔ بہرحال مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کوئی ارضی شے نہیں، ان کا تعلق سماوات سے ہے اور ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ شفاف نہیں تھیں لیکن شفاف ہونے کا تاثر دے رہی تھیں۔

میں مبہوت ہو کر انہیں دیکھتا رہا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ ان پر ہم رنگ حروف میں کچھ لکھا ہوا ہے۔ ذرا غور سے دیکھا تو نظر آ گیا۔ ان پر اللہ لکھا تھا۔

میری عجیب کیفیت ہو گئی۔ جی چاہا کہ سب کچھ بھول کر سمتوں کے متعلق سوچے بغیر وہیں سجدے میں گر جاؤں۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ باطنی اور روحانی عبادت کیا ہوتی ہے۔ میں نے صاف محسوس کیا کہ میرا دل، میرا دماغ ۔۔۔ بلکہ میرے تمام اعضاء حالت سجدہ میں ہیں اور ہر بن مو سے سبحان ربی الاعلیٰ کی صدا

آ رہی ہے۔ اسی کیفیت میں' میں نے سوچا کہ اگر یہ دونوں--- یک لخت میری سوچیں تک ساکت ہو گئیں۔ صرف اس لئے کہ میں انہیں اشرفی کہنا چاہ رہا تھا۔ تو پھر میں انہیں کیا کہوں' میں نے--- بے بسی سے سوچا اور ایک دم میرے اندر سے کسی نے جواب دیا۔ یہ نورانی مہریں ہیں بے وقوف--- مہر وحدانیت!

وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔ حارث بن عثمان کی کھلی ہوئی ہتھیلیوں پر وہ نورانی مہریں رکھی تھیں اور میں انہیں تکے جا رہا تھا۔ جانے کتنی دیر از خود رفتگی کی یہ کیفیت رہی۔ پھر میرے دل میں ایک خواہش بڑی شدت سے ابھری۔ اتنی شدت سے کہ میں احتراماً بھی اس سے لڑ نہ سکا۔ میں نے حارث بن عثمان سے بے حد گھگیا کر کہا۔ "یہ مجھے دکھائیں گے۔ میں انہیں ہاتھ میں لے کر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ مسکرائے۔ "کیوں نہیں۔ یہ تو ہیں ہی تمہارے لئے۔ یہی تمہارا دوسرا کام ہے' جو مجھے تم کو سونپنا تھا۔" یہ کہہ کر انہوں نے وہ نورانی مہریں مجھے دے دیں۔

وہ مہریں میرے ہاتھوں میں آئیں تو جسم میں ایک اداسی دوڑنے لگی۔ نہ جانے کیا ہوا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ مجھے لگا کہ کوئی پانی بہا بہا کر اندر سے مجھے خوب رگڑ رگڑ کر دھو رہا ہے اور میں پاک ہو رہا ہوں۔ آنسو دیر تک بہتے رہے اور بہتے بہتے خود ہی رک بھی گئے۔ اب میں ان کی ماہیت کو سمجھنے کی کوشش کر سکتا تھا۔

مجھے اچنبھا ہوا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بہت ہلکی ہوں گی۔ سونے کا بہت وزن نہیں ہوتا لیکن وہ مہریں میری توقع سے بہت بھاری تھیں مگر میرے ذہن میں ایک لمحے کے لئے بھی ان کے قیمتی ہونے کا خیال نہیں ابھرا۔ ان کے مقدس اور متبرک ہونے کے پہلے تاثر نے کچھ اور سوچنے ہی نہیں دیا تھا۔

میں نے لفظ اللہ پر انگلی پھیری۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ حروف نہ لکھے ہوئے ہیں اور نہ کندہ ہیں۔ اسم ذات اس مہر کی سطح پر نہیں تھا۔ وہ اس کے اندر' گہرائی میں تھا۔ میری انگلیاں اسے چھو نہیں سکتی تھیں۔

پھر میرے اندر ایک اور تجسس ابھرا۔ میں نے ٹکیہ جیسی کسی بڑے سکے جیسی اس مہر کو پلٹ کر دیکھا۔ ایک لمحے کو میری دھڑکن رک سی گئی۔ دوسری طرف خوشنما

نورانی حروف میں کلمہ طیبہ لکھا تھا۔ میں نے انگلی پھیری۔ وہ بھی سطح پر تحریر نہیں تھا بلکہ اس مہر کے بطن میں تھا۔

میرے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ احترام نے میرے وجود کو شل کر دیا تھا۔

جانے کتنی دیر بعد یہ کیفیت ختم ہوئی۔ میں نے سر اٹھا کر حارث بن عثمان کو دیکھا جو مجھے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ "شاید آپ نے کہا تھا کہ یہ میرے ہی لئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہی تمہارا دوسرا کام ہے جو مجھے تم کو سونپنا تھا۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ذرا وضاحت کریں۔"

"ان میں سے ایک تمہارے لئے یعنی تم چاہو تو اسے رکھ سکتے ہو۔ دوسری اللہ کی امانت ہے۔ بہت بھاری ذمے داری ہے۔" انہوں نے کہا اور ایک گہری سانس لی پھر وہ دوبارہ گویا ہوئے۔ "جو امانت ہے' وہ تمہیں کسی اور کو دینی ہے--- کسی ایسے شخص کو جو امین اور دیانت دار ہو اور تمہیں اس کو یہی ہدایت دینی ہے جو میں نے تمہیں دی ہے۔ یعنی وہ کسی امین اور دیانت دار آدمی کو یہ مہر اسی ہدایت کے ساتھ سونپ دے۔"

"یعنی یہ مہر سفر کرتی رہے گی--- ایک ہاتھ سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے ہاتھ---"

"امین اور دیانت دار لوگوں کے درمیان۔" انہوں نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"لیکن ایسے لوگ ہیں کہاں؟" میں نے گھبرا کر کہا۔ "انہیں دیکھ کر تو کسی کی بھی نیت خراب ہو سکتی ہے۔"

"تمہاری نیت تو خراب نہیں ہوئی؟" انہوں نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی--- نہیں ہوئی--- اور میں خود اس پر حیران ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں امین اور دیانت دار نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "میری نیت شاید اس لئے خراب

نہیں ہوئی کہ ایک مہر میرے تصرف میں دے دی گئی ہے۔"

"اللہ تمہیں تم سے بہتر جانتا ہے۔"

"لیکن غرض کے سارے ضرورت مندوں کے اس ہجوم میں' میں ایسا آدمی کہاں تلاش کروں گا۔ یہ بہت بڑی ذمے داری ہے۔ اس کی حفاظت بہت مشکل کام ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لئے تو کوئی کسی کو قتل بھی کر سکتا ہے۔" میرے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔

"اس کی حفاظت تمہاری ذمے داری نہیں۔" حارث بن عثمان نے خشک لہجے میں کہا۔ "کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ کیسی حفاظت کرنے والا ہے۔ جس چیز کی حفاظت کا وہ وعدہ کر لے' اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا' نہ اس کی بے حرمتی ہو سکتی ہے۔ یاد کرو' انجیل اور تورات بھی اللہ کی کتابیں ہیں لیکن آج کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے پاس تحریف و ترمیم سے پاک ایسی انجیل مقدس یا تورات موجود ہے--- بالکل ویسی ہی' جیسی آسمان سے اتری تھی۔ کوئی دعویٰ کرے تو اس پر یقین کوئی نہیں کرے گا اور اللہ نے قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ فرمایا تو آج اس میں کہیں اعراب کا بھی فرق نہیں ہے۔ تو برخوردار آفاق' یہ امانت اللہ کی حفاظت میں ہے۔"

"لیکن میں نے اسے غلط ہاتھوں میں دے دیا تو؟" مجھے ان کے جواب سے ڈھارس تو ہوئی لیکن میں اب بھی گھبرایا ہوا تھا۔

"دیکھو آفاق' اس ملک میں صرف ایک کمی ہے۔ یہاں سیاست دان اور ارباب اقتدار مصلحت کوش' مفاد پرست اور خودغرض ہیں۔ بڑے بڑے جاگیردار' صنعت کار اور پیسے والے زیادہ تر بے ایمان ہیں لیکن عام' غریب آدمی ایسا نہیں۔ ایک ضرورت مند بھوکے کی بے ایمانی اور ایک صاحب ثروت تونگر کی بے ایمانی میں فرق کرنا سیکھو اور یاد رکھو کہ جو شخص بھوک سے مر رہا ہو' اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے حرام کو بھی جائز کر دیا ہے۔ جب اس انداز میں سوچنے لگو گے تو اتنے مایوس نہیں رہو گے۔ رونا ان لوگوں کا نہیں جنہیں ضرورت بے ایمان بنا دیتی ہے۔ رونا ان لوگوں کا ہے جن کے پاس سب کچھ ہے مگر وہ عادتاً" بے ایمانی کرتے ہیں۔ ہوس کے غلام ہو کر بے ایمانی کرتے ہیں۔"

"یہ میری بات کا جواب تو نہیں ہے۔"

وہ مسکرائے "مگر پھر بھی اسے یاد رکھنا' اسے لکھنا۔ تمہاری بات کا جواب یہ ہے کہ یہ جس کے ہاتھ سے بھی غلط ہاتھوں میں جائے گی' وہاں ٹھہرے گی نہیں۔ واپس انہی ہاتھوں میں آ جائے گی۔ خواہ وہ ہاتھ تمہارے ہوں یا اگلے مرحلے کے کسی امین کے۔"

میں نے سکون کی سانس لی۔ "لیکن یہ کیا ہے؟ کیوں ہے؟"

"حکم کی تعمیل کے لئے وضاحت ضروری نہیں۔ لیکن اس معاملے میں سب کچھ بتا دیا گیا ہے اور جو کچھ بتایا گیا ہے' ان مہروں کو آگے بڑھاتے ہوئے اسے بھی آگے بڑھانا ضروری ہے۔ اسے بھی ہدایات کا حصہ سمجھ لو۔ یہ نورانی اشرفیاں یا اللہ کی مہریں پاکستان کی آزادی' خود انحصاری' استحکام اور اسلام کی عظمت اور سربلندی کی علامت اور امین ہیں۔ ان کی منزل پاکستان کا قومی خزانہ ہے۔ انہیں مختلف ہاتھوں سے گزرتے ہوئے پاکستان کے قومی خزانے تک پہنچنا ہے۔ جس دن یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچ گیا' اس دن سے پاکستان میں ایک نیا دور شروع ہو گا۔ اس ملک میں خیر و برکت ہو گی۔ حق کا بول بالا ہو گا۔ عہد نو کے تمام بت توڑ دیئے جائیں گے۔ اسلام کی چیلنج کرتی ہوئی للکار پوری دنیا میں گونجے گی۔ اس اشرفی کا مجوزہ سفر جتنا طویل ہو گا' اتنی ہی سختی دیکھنی پڑے گی' لیکن تکلیف کے بعد ہی راحت ہوتی ہے۔"

"مگر اللہ تو بڑا کارساز ہے۔ وہ قادر مطلق ہے۔ پھر اتنے پیچ کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے اعتراض کیا۔

"اللہ کے ہر کام میں بے شمار حکمتیں ہوتی ہیں۔ یاد کرو' حق و باطل کے آخری معرکے سے پہلے کی صورت حال کے متعلق کیا بتایا گیا ہے۔ مسلمان ہر جگہ خوار و زبوں ہوں گے۔ ان کے حوصلے پست ہوں گے۔ وہ تنزلی کی آخری حد پر ہوں گے۔ یہاں تک کہ وہ مٹھی بھر رہ جائیں گے پھر وہ اللہ کی راہ میں لڑیں گے اور طاغوتی قوتوں کو ملیامیٹ کر دیں گے۔ سنو آفاق! کیا تمہارا جی نہیں چاہتا کہ تم بھی ان مٹھی بھر مسلمانوں میں شامل ہو؟"

"کیوں نہیں۔" میں نے آزردگی سے کہا۔ "لیکن میرے اعمال ایسے نہیں۔"

"اللہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ اب سنو' یہ نورانی اشرفی اللہ کی ہدایت بھی ہے۔ یہ ان مٹھی بھر سعادت مند اور ہدایت یافتہ خوش نصیبوں میں شامل ہونے کی دعوت بھی ہے۔ جس کے ہاتھوں میں بھی یہ پہنچے گی' اسے گویا اللہ کی تائید و ہدایت پہنچے گی۔ خیر و برکت ملے گی اسے۔ وہ خوش نصیب ہو گا اور جو اسے دیانت داری کے ساتھ آگے بڑھا دے گا' اس کی خوش نصیبی پر مہر تصدیق ثبت ہو جائے گی۔ مگر ان خوش نصیبوں میں جس کی نیت میں فتور ہوا' فطرت میں بے ایمانی ہوئی' اس کے پاس سے یہ واپس آ جائے گی اور ایسا شخص بدنصیب ہو گا۔ وہ ہر سعادت سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا جائے گا۔ یوں ہر مسلمان کو خوش نصیبوں میں شامل ہونے کا موقع ملے گا۔ آگے اس کا عمل' اس کا نصیب۔"

"سبحان اللہ--- میں سمجھ گیا۔ یہ تو اللہ کی بڑی رحمت ہے۔" میں نے سنسنی آمیز لہجے میں کہا۔

"اب دوسرے پہلو سے دیکھو۔" حارث بن عثمان بولے۔ "یہ معاشرہ اب انحطاط کی حدوں کو چھو رہا ہے۔ یہاں نیچے سے اوپر تک' عام آدمی کی جیب سے قومی خزانے تک بے برکتی کا دور دورہ ہے۔ اخراجات آمدنی سے زیادہ ہیں۔ قرض سے گزارہ ہوتا ہے اور قرض کا بوجھ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ بے سکونی ہے اور مسلسل بے سکونی مایوسی کو جنم دیتی ہے اور مایوسی وہ چیز ہے کہ بڑھ جائے تو نیکی اور اچھائی کے امکان کو بھی کھا جاتی ہے۔ کسی کو کوئی مستقبل نظر نہیں آتا۔ نہ برائی کرتے ہوئے خوف کے حوالے سے۔ نہ مستقبل کی سوچتے ہوئے دعا کے حوالے سے اور جنہیں اللہ کا خیال ہوتا ہے' وہ سوچتے ہیں کہ اللہ سے کس منہ سے کچھ مانگیں۔ ہمارے اعمال ہی ایسے نہیں۔ دونوں برائیاں ہیں' ایک بہت بڑی اور دوسری چھوٹی۔ بھئی اللہ سے ہدایت تو مانگے بندہ۔ استغفار تو کرلے۔ یہ کیسی نقصان دہ شرمندگی ہے کہ اس کے سامنے ہاتھ پھیلانا بھی چھوڑ دے۔" انہوں نے گہری سانس لے کر خود کو سنبھالا۔ ان کا چہرہ اندرونی جوش سے تمتما رہا تھا۔ "یہ نورانی اشرفی جس کے پاس بھی جائے گی اور جو اسے سچائی اور دیانت داری سے آگے بڑھائے گا وہ ایسی خیر و برکت اور اللہ کی ایسی تائید دیکھے گا کہ وہ اسے معجزہ ہی لگے گی پھر جب وہ اشرفی اس کے

پاس واپس نہیں آئے گی تو اس کا معاشرے کی اچھائی پر اعتماد بحال ہونا شروع ہو گا۔ یہ نیکی کے فروغ کا آغاز ہو گا۔ ایسا شخص سوچے گا کہ ابھی معاشرے میں اچھے لوگ بھی ہیں-- اور بہت اچھے بھی۔ اس میں خود اعتمادی پیدا ہو گی--- اپنی اچھائی کا بھی یقین ہو گا اور اس شخص کی اچھائی کا بھی' جسے اس نے یہ امانت سونپی اور وہ اس کے پاس پلٹ کر نہیں آئی۔"

"بالکل ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔" میں نے جوش سے کہا۔ "میں خوش نصیب ہوں اور انشاء اللہ مجھے اللہ کی ہدایت بھی نصیب ہو گی۔"

"انشاء اللہ" حارث بن عثمان نے بے حد خلوص سے کہا۔ "اور میری دعا ہے کہ اشرفی کا یہ سفر تیز رفتاری سے تکمیل کو پہنچے اور مختصر بھی ثابت ہو کیونکہ جن لوگوں تک یہ اشرفی نہیں پہنچے گی' وہ ایسے ہی ہدایت یافتہ ہو جائیں گے--- بغیر کسی آزمائش کے۔ ہاں' یہ بے ایمانوں کو الگ اور نمایاں کر دے گی۔"

یہ بات بھی میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ بس مجھے اس کو لکھنا تھا۔ میرے ذہن میں نئی کہانی کے خدوخال ابھرنے لگے۔

"چلو--- اب چلیں۔" حارث بن عثمان نے اٹھتے ہوئے کہا۔



اس روز سحری مجھے بہت اچھی لگی۔ اس لئے کہ وہ میری پہلی سحری تھی ورنہ میں اس وقت سو رہا ہوتا تھا۔ بچے روز ہی اٹھتے اور سحری کرتے تھے لیکن اس روز حارث بن عثمان کو دیکھ کر وہ بہت خوش تھے۔ انہوں نے حارث کو از خود ماموں بنا لیا تھا۔ "ماموں' اب آپ ہمارے پاس ہی رہیں۔" میرے بڑے بیٹے نے کہا۔

"عید تک تو تمہارے ساتھ ہیں بیٹے!" حارث بن عثمان نے کہا۔ "لیکن اس کے بعد ہمارے کام شروع ہو جائیں گے۔"

"ماموں' آپ کو کہانیاں آتی ہیں؟" میری چھوٹی بیٹی نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا' کہانیاں تو ہمارے پاس بہت ہیں اور ایسی ہیں کہ نہ کوئی سنائے گا' نہ لکھ سکے گا۔" حارث نے بڑی محبت سے کہا۔

"بس پھر ہم آپ کو نہیں جانے دیں گے۔" میری بیٹی نے فیصلہ سنا دیا۔

میرا بیٹا کسی گہری سوچ میں تھا۔ اس نے سر اٹھایا اور بولا۔ "ماموں' ایک ترکیب ہے۔ آپ دن بھر اپنا کام کریں اور رات کو ہمارے پاس آ جایا کریں۔ ہم آپ کی کہانی سنتے سنتے آپ کے پاس سو جایا کریں گے' ٹھیک ہے نا؟"

اس کے انداز میں اتنی معصومیت تھی کہ حارث انکار نہ کر سکے۔ تائید میں سر ہلا کر رہ گئے۔

میری بیوی ناہید کا رویہ حارث کے ساتھ بے حد احترام آمیز تھا۔ وہ بار بار ان کی طرف کوئی چیز بڑھاتی۔ "یہ لیجئے نا بھائی جان! آپ تو تکلف کر رہے ہیں۔"

"نہیں بہن' سچ کہہ رہا ہوں۔ سحری میں اتنا زیادہ اور اتنا اچھا میں نے کبھی نہیں کھایا۔ ڈر رہا ہوں کہ بدہضمی نہ ہو جائے۔"

میرے ذہن میں ان کی سحری کا تصور لہرا گیا۔ وہ سوکھی روٹی پانی میں بھگو کر کھا رہے تھے۔ میری آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"کھائیں گے تو بدہضمی ہو گی' لیجئے نا۔" ناہید نے حارث سے اصرار کیا۔

دو منٹ بعد حارث نے کہا۔ "اب میں چلتا ہوں۔ وقت ہو رہا ہے۔ مجھے اذان بھی دینی ہے۔"

"میں بھی چلتا ہوں۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

ناہید کی خوشی دیدنی تھی۔ اس کا چہرہ چمک رہا تھا اور وہ مجھے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ صرف اس لئے کہ میں فجر پڑھنے جا رہا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر شرم آنے لگی۔

ہم گھر سے نکلنے لگے تو ناہید نے حارث سے کہا۔ "بھائی جان' افطار سے پہلے گھر آ جایئے گا۔ روزہ یہیں افطار کرنا ہے۔"

"لیکن مسجد--- اذان---" حارث کے لہجے میں الجھن تھی۔

"مسجد میں بتا دیجئے گا اذان کوئی بھی دے دے گا۔" میں نے کہا کیونکہ میں واقف حال تھا۔

"ٹھیک ہے انشاء اللہ میں افطار سے پہلے آ جاؤں گا۔ اچھا بہن' فی امان اللہ۔"

ہم وقت سے پانچ منٹ پہلے مسجد پہنچ گئے۔ مجھے پہلی صف میں جگہ مل گئی۔ وقت ہوا تو حارث بن عثمان نے اذان دی۔ ان کی آواز اور لہجے میں شیرینی' نرمی اور سوز کا عجیب امتزاج تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کی پکار اندر اتر کر جگانے اور مسجد کی طرف بلانے کی بھرپور اہلیت رکھتی ہے۔

نماز کے بعد میں حارث سے ملا۔ انہوں نے کہا۔ "تم جاؤ برخوردار میں تو اب کام کے وقت ہی مسجد سے نکلوں گا۔"

میں انہیں سلام کر کے مسجد سے نکل آیا۔ گھر کی طرف جاتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ یہ کیسی مبارک صبح ہے۔ آج پاکستان پچاس سال کا ہو گیا اور یہ کیسی مبارک صبح ہے کہ مجھ سا بدنصیب دن چڑھے تک سوتے رہنے والا آج جاگا ہوا ہے۔ مجھے سحری اور روزہ نصیب ہوا۔ میں نے فجر پڑھی اور اب پچاس سالہ پاکستان کے نئے سال کی پہلی صبح کا سورج طلوع ہوتے دیکھوں گا۔ اللہ--- میرے رب--- میرے معبود' تیرا کرم ہے۔ تیرا شکر ہے۔

میں گھر پہنچا تو ناہید بچوں کو اسکول کے لئے تیار کر رہی تھی۔ میں سیڑھیوں پر جا بیٹھا۔ اس وقت میری کیفیت عجیب تھی۔ میرے وجود میں شکر کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ آنکھیں رہ رہ کر نم ہوئی جا رہی تھیں۔ میں نے پچاس سالہ پاکستان پر تنے ہوئے شفاف نیلے آسمان کو دیکھا۔ چہچہاتے ہوئے پرندوں کی ایک ڈار میرے سر کے عین اوپر سے گزری۔ میرے زینے کی ریلنگ سے چمٹی ہوئی چنبیلی نے خوشبو کی زبان میں اللہ کی حمد و ثنا اور اس کا شکر ادا کیا۔ میرے جسم سے صبح کی خنک ہوا کا خوش گوار جھونکا ٹکرایا۔ اسی جھونکے نے گملے میں لگے پودے سے کچھ سرگوشی کی۔ پتے جھومے اور اللہ کی ثنا کا گیت گانے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ سامنے والے تمام مکانات' یہاں تک کہ وہ بلڈنگ' جس کے فلیٹ میں' میں رہتا ہوں اور ادھر ادھر ایستادہ درخت' سب رب واحد کے حضور سجدہ ریز ہو گئے ہیں۔ حمد و ثنا میں مصروف ہیں۔ اس کا شکر ادا کر رہے ہیں۔ میں پانی پانی ہو گیا اور وہ سمندر میری آنکھوں سے بہہ نکلا۔ میں بے اختیار سجدے میں گر گیا۔ وہ شکر اور استغفار کا لمحہ تھا۔

بعد میں' میں سیڑھیوں پر بیٹھا سوچتا رہا کہ اللہ کی کتنی نعمتیں ہماری نظروں کے

سامنے ہوتی ہیں مگر انہیں دیکھنا تو درکنار ہم بدنصیب انہیں محسوس کئے بغیر ناشکرے پن سے سوچتے ہوئے محرومی' اضطراب اور بے سکونی کے راستے پر چلے جاتے ہیں--- چلتے--- بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ کتنی خوشیاں' کتنی سرشاریاں' کتنی طمانیت' کتنی آسودگی' اللہ نے چپے چپے پر ہمارے لئے بکھیری ہوئی ہے لیکن ہم اس سے خود کو محروم کرلیتے ہیں۔

وہ شب انقلاب کے بعد کی پہلی صبح تھی!



مجھے نہیں معلوم تھا کہ کس روز خیرو برکت کا مفہوم مجھ پر کھلے گا۔

بچے اسکول چلے گئے تو میں سیڑھیوں سے اٹھا اور فلیٹ کا دروازہ بند کرکے اپنی اسٹڈی میں آ بیٹھا۔ میز پر میرے رائٹنگ پیڈ کا کھلا اور نامکمل صفحہ مجھے کہانی کے پیچ کی یاد دلانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میری توجہ اس کی طرف بالکل نہیں تھی۔

ناہید برتن وغیرہ سمیٹنے کے بعد اب انہیں دھونے اور کچن کی صفائی میں مصروف ہو گئی تھی۔ میں اس وقت ایسا سکون محسوس کر رہا تھا--- ایسا بے پایاں سکون جو میرے لئے بالکل نیا تھا۔

میں نے وہ نورانی مہریں یا اشرفیاں جیب سے نکالیں اور اپنی ہتھیلی پر رکھ کر انہیں بہت غور سے دیکھنے لگا۔ وہ میری ہتھیلی پر ایسی پوزیشن میں رکھی تھیں کہ ایک کا اللہ کے نام والا اور دوسری کا کلمہ طیبہ والا رخ اوپر تھا۔ انہیں دیکھتے ہی پھر میری کیفیت عجیب ہو گئی۔ میرا جسم لرزنے لگا لیکن اس کا سبب خوف نہیں' ایک عجیب سا کیف و سرور تھا۔

اچانک نہ جانے کیا ہوا؟ میرا وہ ہاتھ بے اختیار کپکپایا' جس پر وہ نورانی اشرفیاں رکھی تھیں--- اور میرے سنبھلنے سے پہلے ہی وہ نیچے گرتی نظر آئیں۔ میں انہیں فرش پر گرنے سے بچانے--- انہیں ہوا میں پکڑنے کے لئے جھپٹا--- لیکن ناکام رہا۔ وہ فرش پر گر گئیں۔

اللہ کے نام اور کلمہ طیبہ کی بے حرمتی اور اپنی کوتاہی کے تصور نے مجھے نیم جاں کر دیا۔ میں پوری جان سے کانپ رہا تھا۔ میں نے لرزتا ہوا ہاتھ بڑھا کر انہیں فرش سے اٹھانا چاہا لیکن میرا ہاتھ ان سے کوئی چھ انچ اوپر ہی ساکت ہوگیا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس ناقابل یقین منظر کو دیکھتا رہا۔ میرے کانوں میں حارث بن عثمان

کی آواز گونجی۔۔۔ "کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ کیسی حفاظت کرنے والا ہے۔ جس چیز کی حفاظت کا وہ وعدہ کرے' اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ نہ اس کی بے حرمتی ہو سکتی ہے۔۔۔ اور برخوردار آفاق' یہ امانت اللہ کی حفاظت میں ہے۔"

میں حیرت اور بے یقینی سے تکتا رہا۔ فرش پر گرتے ہی۔۔۔ بلکہ شاید اس سے پہلے ہی وہ نورانی مہریں ہیئت بدل چکی تھیں۔ ان کی رنگت اب طلائی تھی۔۔۔ عام سونے جیسی۔ وہ نورانی رنگت جس کی وجہ سے وہ شفاف لگتی تھیں' جس کی وجہ سے ان کے اندر سنہری شعاعیں پھوٹتی محسوس ہوتی تھیں' وہ غائب ہو چکی تھی۔ اب ان کی وہ سماوی رنگت نہیں تھی۔ میں کہہ سکتا تھا کہ پرانے زمانے کی اشرفیاں بالکل ایسی ہوتی ہوں گی اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے اندر موجود اللہ کا نام اور کلمہ طیبہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

سب کچھ بدل گیا تھا مگر میں اب بھی ان کی بے حرمتی کے خیال سے لرزاں تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ان عام اشرفیوں کو چھوا۔ وہ واقعی عام اشرفیوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ میں نے بڑی احتیاط بھری نرمی سے انہیں اٹھایا اور پھر اپنی ہتھیلی پر رکھا۔ اگلا لمحہ پھر حیرت کا تھا۔ میری ہتھیلی پر وہی نورانی اشرفیاں رکھی تھیں۔ ایک میں اللہ کے نام اور دوسری میں کلمہ طیبہ کے نورانی حروف نظر آ رہے تھے۔

اسٹڈی کے دروازے پر قدموں کی چاپ ابھری تو میں نے نورانی اشرفیوں کو جلدی سے جیب میں رکھ لیا۔ ناہید اندر آئی اور اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ "کیا بات ہے' سوئے نہیں تم؟ تم تو رات کو جاگتے نہیں ہو۔ نیند کے بہت پکے ہو۔"

"ہاں' مجھے بھی حیرت ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔"

"واقعی۔۔۔ حیرت کی بات ہے۔" وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

مجھے ایک خلش ستا رہی تھی۔ "میں حارث بن عثمان کو لایا' تمہیں برا تو نہیں لگا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ خیال کیوں آیا تمہیں؟"

"دراصل گھر کی صورت حال ایسی ہے کہ ممکن ہے تمہیں وہ بوجھ لگے ہوں۔"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے تو ان کا آنا اچھا لگا۔ اس لئے تو ان سے

افطار سے پہلے آنے پر اصرار کیا۔ ہاں یہ افسوس ہوا کہ ان کی ٹھیک سے خاطر نہیں کر سکے ہم۔ برا لگنے کا تو سوال ہی نہیں۔ مجھے تو وہ پہلی نظر میں بھا گئے۔ بہت بابرکت انسان ہیں۔"

"یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا؟"

"بھئی۔۔۔ تم نے رات عبادت کی۔ پھر روزہ رکھا۔ فجر پڑھی ماشاء اللہ اور برکت کیا ہوتی ہے؟"

میں کھسیا گیا۔ "اللہ کی دی ہوئی توفیق ہے یہ تو۔"

"اچھے لوگوں کی سنگت بھی فیض پہنچاتی ہے۔" ناہید نے عالمانہ انداز میں کہا۔

"اچھا یہ تو بتاؤ' ان سے ملے کیسے؟"

میں ناہید کو اشرفیوں کے بارے میں بتانا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں؟ یہ مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ بہرکیف اسی لئے اس کو تفصیل بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ "مسجد میں ملاقات ہوئی تھی۔" میں نے مختصراً کہا۔

"ان کے متعلق بھی تو بتاؤ۔۔۔ گھر۔۔۔ بیوی۔۔۔ بچے۔۔۔؟"

میں سوچ میں پڑ گیا کہ اس سوال کا جواب دینے سے کیسے بچوں۔ اسی لمحے میرے دماغ میں جیسے روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ کہانی کی رکاوٹ دور ہو گئی تھی۔ کہانی کے پیچ کا بہترین حل مجھے سوجھ گیا تھا۔ "ناہید۔۔۔ بس اب تم جاؤ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" میرے لہجے میں مسرت اور سنسنی تھی۔

"ارے۔۔۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا اچانک؟" ناہید نے حیرت سے پوچھا۔

"کہانی کا پیچ دور ہو گیا۔ مسئلہ حل ہو گیا' اب مجھے لکھنا ہے۔"

ناہید بھی خوش ہو گئی۔ "یہ تو بہت اچھا ہوا۔ کل کہانی دے کر پیسے لے آؤ تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"یہ ناممکن بھی نہیں ہے۔ سنو' آج کا گزارہ تو ہو جائے گا نا۔"

"ہاں لیکن کل کی سحری کا نہیں پتہ۔"

"اللہ مالک ہے۔ اب مجھے لکھنے دو' تم جاؤ۔"

ناہید اٹھنے لگی مگر اچانک اس کے چہرے پر پریشانی کا تاثر ابھرا۔

"سنو۔۔۔ کیا تم روزہ توڑ دو گے؟" اس نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ "اللہ نہ کرے' روزہ کیوں توڑوں گا میں؟"

"خود ہی تو کہتے ہو کہ سگریٹ کے بغیر کام نہیں ہوتا۔"

"ہاں' یہ تو ہے۔ مجھے خیال ہی نہیں آیا اس بات کا۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "خیر۔۔۔ کچھ بھی ہو روزہ تو میں توڑنے والا نہیں مگر یہ کیا کم ہے کہ پیچ دور ہو گیا ہے۔ کم از کم میں اسے تو نوٹ کر ہی لوں گا۔"

ناہید کے چہرے پر مایوسی کا سایہ دیکھ کر مجھے رنج ہوا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ کہانی مکمل نہیں ہوئی اور میں وہ لے کر نہیں گیا تو پیسے نہیں ملیں گے۔ اس کا مطلب تھا کہ کل سے فاقے شروع اور اب تو عید میں بھی زیادہ سے زیادہ تین دن ہیں۔ عید پر کیا ہو گا۔ خود میں بھی یہی سوچ رہا تھا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ کہانی مکمل ہونے کا امکان سامنے ہوتے ہوئے بھی روزے سے دستبردار ہونے کا خیال میرے ذہن میں بھی نہیں آیا۔ دیکھا جائے گا۔ میرے اندر کسی نے بڑی بے پرواہی سے کہا لیکن میں نے ناہید کو حوصلہ دینے کے لئے بے حد امید افزا لہجے میں کہا۔ "اور کیا پتہ' کام ہو ہی جائے۔"

لیکن میرا دلاسا بھی اس کی آنکھوں میں امید نہ چمکا سکا۔ بہرحال وہ کچھ کہے بغیر اٹھ کر چلی گئی۔

میں اپنے پیڈ پر جھک گیا۔ میں نے سوچا یہ تھا کہ ذہن میں آنے والی ان نئی تفصیلات کو نوٹ کر لوں گا' جنہوں نے کہانی کی رکاوٹ دور کی ہے مگر ہوا یہ کہ میں نے نامکمل کہانی آگے بڑھا دی۔ پھر میرا قلم اتنی روانی سے چلا اور کہانی اتنی تیزی سے آگے بڑھی کہ صفحے کے صفحے سیاہ ہونے لگے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ میں نے زندگی میں کبھی اتنی تیز رفتاری سے کام نہیں کیا تھا اور لطف یہ کہ اس دوران میں مجھے سگریٹ کی طلب بھی محسوس نہیں ہوئی تھی بلکہ خیال تک نہیں آیا تھا۔

کلاک نے ایک بجایا تو میں چونکا۔ مجھے خیال آیا کہ ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا ہے اور یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ میں سات صفحے لکھ چکا ہوں۔ اب میرے

اندازے کے مطابق کہانی بمشکل تین ساڑھے تین صفحے کی اور تھی۔ سچی بات یہ کہ کہانی کو اس مقام پر چھوڑ کر اٹھنے کو میرا دل نہیں چاہ رہا تھا مگر باطن کی کسی قوت نے مجھے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے جا کر وضو کیا اور گھر میں ہی نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا۔

میرا خیال تھا کہ کہانی میں دھیان ہونے کی وجہ سے میں بس جیسے تیسے نماز پڑھ سکوں گا مگر اس نماز میں مجھے معلوم ہو گیا کہ اللہ کی توفیق و تائید اور اس کی عنایت کیا ہوتی ہے۔ میں نے وہ ایسی نماز پڑھی کہ جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نماز میں ایسی یکسوئی اور ارتکاز تو میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔

نماز پڑھ کر میں دوبارہ اسٹڈی میں آ گیا مگر اس بار مجھ سے لکھا نہیں گیا۔ ایک سطر لکھتے لکھتے سگریٹ کی طلب ہونے لگی۔ خاصی دیر کی ناکام کوشش کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ اب سگریٹ کے بغیر کام نہیں ہو گا۔ اس کے باوجود مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ میں مطمئن تھا۔ اب اختتام تک کہانی میں کہیں کوئی رکاوٹ نہیں تھی اور زیادہ کام بھی نہیں تھا۔ افطار کے بعد میں اسے بہ آسانی مکمل کر سکتا تھا۔

مجھ پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ میں ہلکا پھلکا تھا۔ رات بھر کا جاگا ہوا بھی تھا۔ نیند آنے لگی۔ میں سونے کے لئے لیٹ گیا۔ فوراً ہی نیند بھی آ گئی۔

سو کر اٹھا تو چار بجے تھے۔ ہاتھ منہ دھو کر میں تازہ دم ہوا اور اسٹڈی میں آ گیا۔ میں نے لکھنے کی نیم دلانہ کوشش کی لیکن پھر سگریٹ کی طلب ہونے لگی۔ میں نے قلم بند کر کے رکھا اور پاؤں پھیلا کر سکون سے بیٹھ گیا۔

اسی وقت ناہید اسٹڈی میں چلی آئی۔ اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے؟ کیوں پریشان ہو؟" میں نے پوچھا۔

"آج افطار کا اہتمام ہونا چاہیے تھا۔" وہ افسردگی سے بولی۔

"تو پھر؟"

"گھر میں کچھ بھی تو نہیں ہے نہ بیسن' نہ تیل' ورنہ پکوڑے تل لیتی۔ دودھ ہوتا تو شربت بن جاتا۔ کل کے بچے ہوئے تھوڑے سے پھل ہیں مگر ان سے بہت تھوڑی چاٹ بنے گی اور تم جانتے ہو کہ بچے ہمارے فروٹ چاٹ پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ وہ تو کسی کو کھانے ہی نہیں دیں گے۔"

"تو کیا ہوا۔ کام چل جائے گا۔" میں نے بے پرواہی سے کہا۔ "آج ایسی کیا خاص بات ہے کہ تم اس طرح پریشان ہو رہی ہو۔"

"خاص بات نہیں' باتیں ہیں آج۔ 27 واں روزہ ہے۔ تم نے روزہ رکھا ہے اور حارث بھائی بھی ہمارے ساتھ افطار کریں گے۔"

میں نے چند لمحے سوچا اور پھر کندھے جھٹک دیئے۔ "جب کچھ نہیں ہو سکتا تو پریشان ہونے سے فائدہ۔۔۔"

اسی لمحے اطلاعی گھنٹی بجی۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا اور حیران رہ گیا۔ سامنے والی پرچون کی دکان کے مالک کا لڑکا سعید کھڑا تھا۔ اس کے پیروں کے پاس بہت سارا سامان رکھا تھا۔ لگتا تھا' گھر کا ماہانہ سودا آ گیا ہے۔ "کیا بات ہے سعید؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کا سودا لایا ہوں انکل!"

"لیکن ہم نے تو نہیں منگوایا؟" میں نے کہا۔ اسی لمحے ناہید بھی دروازے پر آ گئی۔ سامان دیکھ کر اسے بھی حیرت ہوئی۔

"یہ دیکھیں' پرچہ آپ کا نہیں ہے؟" سعید نے میری طرف لسٹ بڑھائی۔ میں نے دیکھا۔ اوپر فلیٹ نمبر 35 لکھا تھا جو کہ میرے ہی فلیٹ کا تھا۔ مگر وہ تحریر نہ میری تھی' نہ ناہید کی۔ ناہید بھی نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

"نہیں سعید۔ کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ نمبر تو ہمارے ہی فلیٹ کا ہے لیکن یہ پرچہ ہم نے نہیں بھجوایا۔"

سعید نے سر پکڑ لیا۔ "یہ سامان 53 کا ہے۔ انہوں نے نمبر الٹ کر لکھ دیا۔" وہ بڑبڑایا پھر پریشان ہو گیا۔ "اب روزے میں یہ ٹینشن بھی ہو گی۔"

میں اور ناہید اسے ہمدردانہ نظروں سے دیکھتے رہے۔ بے چارہ اتنا سامان اٹھا کر تیسری منزل تک آیا تھا اور اب سامان نہ صرف واپس لے جانا تھا بلکہ 53 میں بھی پہنچانا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ برابر والے زینے پر چوتھی منزل کا فلیٹ ہے۔

اچانک سعید کی آنکھوں میں چمک سی ابھری۔ "انکل آپ کا سودا بھی تو ہماری دکان سے آتا ہے۔ آپ کا مہینے کا سودا بھی تو آنا ہے۔"

"آنا تو ہے' ہم کل منگوائیں گے۔"

"اب روزے میں یہ سودا واپس لے جانے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ پلیز۔۔ آپ یہ رکھ لیں نا۔" سعید کے لہجے میں التجا در آئی۔

"لیکن اس وقت ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"تو کیا ہوا۔ کل' پرسوں میں دے دیجئے گا' میں ابی کو بتا دوں گا۔"

"لیکن۔۔۔" ناہید نے احتجاج کرنا چاہا۔

"میں سمجھ گیا۔" سعید نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ تقریباً وہی کچھ ہے جو آپ کے ہاں بھی آتا ہے پھر بھی آپ پرچے سے چیک کر لیں۔ کوئی چیز آپ کے حساب سے کم ہو تو میں لا دوں گا۔ زیادہ ہوئی تو واپس لے جاؤں گا۔"

"اور 53 والوں کو بھی تو ضرورت ہے۔" ناہید نے فکرمندی سے کہا۔

"آپ پانچ منٹ میں سودا چیک کر لیں پھر میں یہ پرچہ لے کر جاؤں گا اور 53 والوں کا سودا بھی افطار سے پہلے پہنچا دوں گا۔"

میں اور ناہید مل کر سودا چیک کرنے لگے۔ سعید دروازے پر ہی کھڑا رہا۔ ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ آٹا' چاول' تیل' گھی' دالیں' چائے کی پتی' چینی' سرکہ' صابن' مصالحے' بیسن۔۔۔ "سب چیزیں وہی ہیں جو ہم منگواتے ہیں حتیٰ کہ مقدار بھی وہی ہے ہر چیز کی۔" ناہید نے کہا۔

"سبحان اللہ۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

"ہمارے ہی گھر کا سودا لگتا ہے۔" ناہید بولی۔

"الحمدللہ۔ گھر کا ہی نہیں' ہمارے نصیب کا ہے۔" میں نے کہا۔

"کچھ چیزیں کم ہیں' وہ دوسرے پرچے پر لکھ دیتی ہوں۔"

ناہید نے اضافی پرچہ سعید کو دیتے ہوئے کہا۔ "واپس کچھ نہیں کرنا ہے' بس یہ چیزیں اور لا دو۔"

"آج نہیں آنٹی' کل لا دوں گا۔ آج تو 53 والوں کو بھی سودا پہنچانا ہے ابھی۔ روزے میں میری اتنی ہمت نہیں۔"

"میں وحید کو ساتھ بھیج دیتی ہوں۔ یہ ہلکی چیزیں ہیں وہ لے آئے گا۔ اسے دے دینا۔" ناہید نے بڑے بیٹے کو پکارا۔

"وحید——— ادھر آؤ———"

"ٹھیک ہے آنٹی۔"

"میں پیسے کل پہنچا دوں گا۔" میں نے کہا۔

"وہ تو ہوتا رہے گا انکل۔ اس وقت تو آپ نے مجھ پر بہت بڑی مہربانی کی ہے۔" سعید نے ممنونیت سے کہا پھر وہ وحید کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ میں سودا کچن میں رکھوانے میں ناہید کا ہاتھ بٹانے لگا۔ "اسے کہتے ہیں چھپر پھاڑ کر ملنا۔" ناہید نے خوشی سے کہا۔

"جی نہیں۔ اسے کہتے ہیں اللہ کی تائید——— اللہ کی مدد۔" میں نے بھیگی آواز میں کہا۔ "ان تمام چیزوں کی طلب تھی ہمیں لیکن مل نہیں سکتی تھیں۔ اب دیکھو کہ یہ بن مانگے ملیں۔ پیسوں کا بھی کوئی مطالبہ نہیں اور الٹا وہ سعید ہمارا احسان مان رہا تھا۔"

"سچ کہتے ہو۔ اب ڈھنگ سے افطار ہو جائے گا۔"

میری آنکھیں بھیگنے لگیں۔ حارث بن عثمان نے کہا تھا——— یہ نورانی اشرفی' جس کے پاس بھی جائے گی اور جو اسے سچائی اور دیانت داری سے آگے بڑھائے گا' وہ ایسی خیر و برکت اور اللہ کی ایسی تائید دیکھے گا کہ وہ اسے معجزہ ہی لگے گی اور ابھی میں نے اشرفی آگے بڑھائی بھی نہیں تھی کہ یہ بات ثابت ہو گئی تھی۔

ناہید افطار کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ میں عصر کی نماز کے لئے مسجد کی طرف چل دیا۔



میں اور حارث بن عثمان عشاء کی نماز پڑھ کر گھر کی طرف واپس آ رہے تھے۔ میں بہت خوش اور مطمئن تھا۔ افطار کے بعد میں نے کہانی کا مزید ایک صفحہ لکھا تھا۔ ناہید بھی خوش تھی کہ اس نے افطار کا خاصا اہتمام کیا تھا۔ حارث بن عثمان افطار سے

پانچ منٹ پہلے گھر آ گئے تھے لیکن انہوں نے افطار میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ ناہید کے اصرار پر انہوں نے کہا۔ "بیٹی' میں تو افطار کے فوراً بعد جو روکھی سوکھی مل جائے' کھا لیتا ہوں۔ ان سب کی تو مجھے عادت ہی نہیں۔"

پھر بھی ناہید نے انہیں تھوڑا بہت کھانے پر مجبور کر دیا۔ پھر وہ خود کچن میں روٹی پکانے چلی گئی اور پانچ منٹ بعد اس نے کھانے کا دسترخوان لگا دیا۔ میں تو اتنی جلدی کھانا نہیں کھا سکتا تھا۔ البتہ بچے حارث کے ساتھ بیٹھ گئے۔

مسجد سے نکل کر حارث کے ساتھ چلتے ہوئے میں اس دن کی برکتوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ بڑا بابرکت دن ثابت ہوا تھا۔ مجھے اس دن نے طمانیت اور بے فکری ہی دی تھی۔ گھر میں راشن کا مسئلہ نہیں تھا۔ دوسری طرف رکی ہوئی کہانی تقریباً مکمل ہو چکی تھی جس کے عید سے پہلے مکمل ہونے کے کوئی آثار نہیں تھے اور اس کا مطلب تھا کہ ہمارے گھر میں بھی انشاء اللہ عید ہو گی۔

میں نے سوچا' گھر جاتے ہی کہانی مکمل کروں گا۔ اسی لمحے عقب سے جانی پہچانی آواز نے کہا۔ "کہانی تو ابھی شروع کرنی ہے برخوردار!" میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ بابا عصر تھے اور اپنی مخصوص تیز رفتاری کے ساتھ چل رہے تھے۔"

میں نے اور حارث بن عثمان نے انہیں سلام کیا اور ہاتھ ملایا۔ ہم اس دوران میں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں رکے تھے۔ "جی ہاں بابا!"

"تو اب ہم بات کر سکتے ہیں۔" بابا عصر نے گہری سانس لے کر کہا۔ "کل میں نے محسوس کیا کہ پاکستان سے سچی محبت کے باوجود تم پاکستان کی اہمیت سے واقف نہیں ہو۔"

"میں پاکستان کی اہمیت تو سمجھتا ہوں بابا لیکن جیسی غیر معمولی اہمیت کا آپ کی باتوں سے اشارہ ملتا ہے' میں اسے سمجھنے سے قاصر ہوں۔" میں نے کہا۔

"پاکستان کی غیر معمولی اہمیت یہ ہے کہ اللہ نے اسے اہمیت دی ہے۔" بابا عصر نے پرخیال لہجے میں کہا۔

"یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آتی۔" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں آتی' آنی چاہیے۔" بابا عصر نے جھنجلا کر کہا۔ "اللہ کبھی خود

بندوں کے سامنے نہیں آیا' انہیں سمجھانے اور قائل کرنے کے لئے اور اسے قائل کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ وہ تو بے نیاز ہے۔ یہ اس کی رحمت اور عنایت ہے کہ وہ اپنے بندوں کی فکر کرتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ وہ بے خبری میں گمراہ ہوں۔ وہ انہیں گمراہی سے بچانا چاہتا ہے اس لئے انہیں سمجھاتا ہے کہ کیا غلط ہے اور کیا درست؟ وہ انہیں حق کا راستہ دکھاتا ہے اور میں نے کہا نا کہ وہ خود سامنے آکر بندوں کو نہیں سمجھاتا۔ یہ اس کی شان کے خلاف ہے۔ سو وہ ابتداء سے اپنے بندوں کے پاس سفارتیں بھیجتا رہا--- اپنے پیغمبر اور رسول۔ سرکش اور نافرمان بندوں نے' شیطان کے چیلوں نے اس کے سفیروں کا مذاق اڑایا' انہیں جھٹلایا' انہیں اذیتیں پہنچائیں۔ یہاں تک کہ انہیں قتل بھی کر دیا۔ یوں ان پر اللہ کا غضب ہوا لیکن بہرحال اللہ نے حجت تمام کر دی۔ اس کا کوئی بندہ بھی گمراہی کے جواز میں اپنی بے خبری کی ڈھال سامنے نہیں لا سکتا۔ حق سے اس کا انکار اس کے منہ پر مار دیا جائے گا۔"

"جی' یہ تو ہے لیکن پاکستان---"

"یہاں تک پہنچنے میں جو صدیاں لگی ہیں' انہیں کیسے چھوڑ دوں۔" بابا عصر نے مجھے ڈانٹ دیا۔ "تم میری بات سنتے رہو۔ یہ سب کچھ تمہیں لکھنا ہے۔ لکھنے بیٹھو گے تو میرا کہا ہوا کوئی ایک لفظ بھی انشاء اللہ نہیں بھولو گے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اللہ اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے ہر دور میں سفارتیں بھیجتا رہا۔ خوش نصیب ان سے فیض اٹھاتے رہے لیکن بڑی تعداد میں بدنصیب اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت پر اللہ نے خاص عنایات فرمائیں' انہیں بے حد نوازا' آسمان سے ان کے لئے خصوصی نعمتیں اتاریں مگر پھر اللہ نے انہیں دھتکار دیا۔ کیوں؟ یہ پوری انسانیت کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے۔ کبھی نہیں بھولنا چاہئے۔ مسلمانوں کو خاص طور پر تاکہ وہ ان اعمال سے بچے رہیں' جن کی وجہ سے اللہ کی ایک پسندیدہ قوم اس کی مغضوب ہوئی اسی لئے تو سورۂ فاتحہ میں یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ دکھا ہم کو راستہ سیدھا' ان لوگوں کا کہ جن پر تو نے انعام فرمایا۔ نہ کہ ان بھٹکنے والوں کا جن پر غضب ہوا تیرا۔

بہرکیف پھر اللہ نے روئے زمین کے بدترین معاشرے کو اپنے سب سے محبوب پیغمبر سے نوازا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم' جو وجہ' تخلیق کائنات ہیں۔ جن پر خود اللہ اور اس کے فرشتے درود و سلام بھیجتے ہیں جو کائنات کے واحد مثالی انسان ہیں۔ جن کی سیرت اور کردار ایک روشن معجزہ ہے۔ یہ اللہ کی آخری سفارت ہے۔ اللہ نے واضح طور پر بتا دیا کہ اس کے بعد کوئی پیغمبر دنیا میں نہیں آئے گا۔ نبوت کا سلسلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل کر کے ختم کیا جا رہا ہے۔ تم دیکھ لو کہ دنیا میں ہمیشہ نیکی کے مقابلے میں بدی کی کثرت رہی اور لوگوں نے جھوٹی پیغمبری کے دعوے بھی کئے لیکن بدی کی کثرت کے باوجود نہ وہ دعوے کرنے والے پنپے اور نہ ان کے ماننے والے۔

تو یہ طے ہے کہ اب اللہ کی طرف سے کوئی پیغمبر نہیں آئے گا لیکن اللہ بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ یہ نہیں کہ اس نے نعوذ باللہ اپنے بندوں کو چھوڑ کر ان کی ہدایت سے ہاتھ اٹھا لیا۔ ایسا نہیں ہے۔ اس نے مکمل ہدایت دے دی۔ دین مکمل کر کے اپنے بندوں کو روشنی کا منبع دکھا دیا۔ گویا حجت تمام کر دی۔ اب یوم حساب کسی ظالم کے پاس کوئی عذر نہیں ہو گا اپنے ظلم اور گمراہی کا۔ اس لئے کہ اس آخری ہدایت کے بعد بھٹکنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ انسان کو عقل دے کر اس نے پہلے ہی تمام مخلوقات سے افضل بنا دیا تھا۔ اب مکمل ہدایت کے ذریعے اسے درست طور پر سوچنے' سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی روشنی بھی دے دی۔ اب اس کے بعد بھی کوئی بھٹکے تو وہ اس کے نفس کی خرابی ہے اور وہ اپنی جان پر ظلم کر رہا ہے۔"

"مگر ہم ان لوگوں کے مقابلے میں تو بدنصیب ہیں جنہیں حضورؐ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور آپؐ کی باتیں سننے کی سعادت حاصل ہوئی۔" میں نے کہا۔

"درست ہے لیکن اللہ کا کرم دیکھو' اس نے اپنے روشن ہدایت نامے کو تمہارے لئے قیامت تک پوری درستی کے ساتھ محفوظ رکھنے کا وعدہ فرمایا اور اللہ اپنا وعدہ پورا کرتا ہے۔ سو وہ روشن ہدایت نامہ تمہارے پاس ہے۔ اسے نہ پڑھو اور سمجھو تو یہ تمہاری بدعملی ہے۔ پھر سیرت طیبہ کا کون سا ایسا پہلو ہے جو انسانوں کی نگاہ سے اوجھل ہے۔ حضور پاکؐ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ریکارڈ پر محفوظ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ گویا تمہیں

یہ بھی معلوم ہے کہ قرآن کے احکام پر عمل کیسے کیا جاتا ہے اور رہی محرومی کی بات تو اللہ اس محرومی کا تمہیں صلہ بھی دیتا ہے۔ ہر آگے بڑھتے ہوئے دور میں چھوٹی سی نیکی کا اجر بھی بیش از بیش ہوتا جاتا ہے۔ توفیق بھی بڑھا دی گئی ہے۔"

"کچھ بھی ہو' وہ براہ راست ہدایت کی بات تو نہیں آسکتی ہے۔"

"یہ گمراہی کا جواز نہیں ہے۔ اپنے گناہوں کی اس طرح صفائی پیش نہیں کی جا سکتی۔"

میں کانپ کر رہ گیا۔ "میرا یہ مطلب نہیں میں تو بس ایک بات کہہ رہا ہوں۔"

"مگر میں بھی تو کچھ کہہ رہا ہوں۔" انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔ "اللہ نے عقل و دانش والوں کے لئے ہر چیز میں حق کی نشانیاں روز اول سے ہی رکھ دی تھیں۔ جنہیں توفیق عطا ہوئی' انہوں نے سر جھکایا مگر اب تو اس نے رسالت اور ہدایت کے ذریعے عقل کو ایسی روشنی عطا کی ہے کہ بھٹکنے کی گنجائش ہی نہیں۔

اور اللہ نے قرآن پاک میں سب کچھ کھول کھول کر بیان کر دیا ہے۔ وہ کون سے جرائم تھے' جن کی پاداش میں اللہ کے پسندیدہ لوگ اس کے عتاب میں آئے اور راندہ درگاہ ٹھہرے' یہ سب قرآن میں موجود ہے تاکہ رسول کریمؐ کی امت ان اعمال سے بچی رہے اور وہ اعمال کیا تھے؟ بنی اسرائیل میں کچھ بنیادی خرابیاں تھیں' جنہیں وہ دور نہ کر سکے۔ پہلی بات یہ کہ وہ نافرمان تھے۔ وہ اللہ کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے رہے۔ اللہ نے جو قانون بنائے انہوں نے توڑے۔ وہ کم ظرف تھے' اللہ نے ان پر جو انعام و اکرام کئے' انہوں نے انہیں مغرور اور بددماغ کر دیا۔ وہ ناشکری کرتے رہے۔ بجائے اس کے کہ شکر ادا کرتے وہ اللہ' اسکے رسولؐ اور اس کی کتابوں پر ایمان لائے تو یوں جیسے کہ نعوذ باللہ انہوں نے احسان کیا ہو۔ پھر وہ ست' کاہل اور آرام طلب تھے۔ وہ تو اپنے لئے بھی کچھ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اللہ کو وہ سرفروش پسند ہیں جو اس کی راہ میں دامے' درمے' قولے' سخنے جہاد کریں۔ جن کے دل میں شوق شہادت ہو جبکہ ان سہل پسندوں کو جب بھی اللہ نے جنگ کا حکم دیا تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تم اور خدا جا کر لڑو' ہم یہیں بیٹھے ہیں۔ ہم کیوں

لڑیں اور قتل ہوں جبکہ دشمن ہم سے زیادہ طاقتور ہے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ جب اللہ سب کچھ کر سکتا ہے تو پھر ہمارے دشمنوں کو خود ہی زیر کیوں نہیں کر دیتا۔ انہوں نے خدا کے اختیار کو صرف اس لئے مانا کہ اس طرح انہیں بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے' بیٹھے بٹھائے تحفظ سمیت سب کچھ مل جائے گا۔ چنانچہ جب ان بدبختوں پر اللہ کا غضب ہوا تو وہ معزول کر دیئے گئے۔ اس کے بعد ان کی ذلت و خواری اور سرگردانی کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اللہ نے دکھا دیا کہ یہ ہے سرکشوں اور نافرمانوں کا انجام۔

تو میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اللہ نے تمہیں روشن عقل دی۔ ہدایت دی اور اس کی نشانیاں چپے چپے پر بکھری ہوئی ہیں۔ دیکھو' مشاہدہ کرو' سوچو اور انہیں پہچانو۔ ان سے نتائج اخذ کرو۔ کس کی کیا اہمیت ہے' اسے پہچانو ــــ اور اس اہمیت کے مطابق ہی اس کا خیال رکھو۔" یہ کہتے کہتے وہ چونکے۔ انہوں نے سر ایک طرف جھکایا' جیسے کوئی دور کی آواز سننے کی کوشش کر رہے ہوں "اب میں چلتا ہوں۔" انہوں نے کہا۔ ان کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔

"لیکن ابھی تو میں کچھ سمجھا بھی نہیں ہوں۔" میں نے احتجاج کیا۔ مجھے ان سے قدم ملا کر چلنے کے لئے اب تقریباً دوڑنا پڑ رہا تھا۔

"سب سمجھ جاؤ گے۔ میں کل یہیں سے ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑوں گا۔" بابا عصر نے کہا۔ "بس اب جاؤ۔"

"مگر میں یہ سب بھول جاؤں گا۔" میں نے بلند آواز میں کہا کیونکہ میرے دوڑنے کے باوجود بابا عصر مجھ سے خاصا آگے جا چکے تھے۔

"تم کچھ نہیں بھولو گے۔" انہوں نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔ لمحوں میں فاصلہ اتنا بڑھ گیا کہ اب چیخ کر بھی بات ان تک نہیں پہنچائی جا سکتی تھی۔ بابا عصر تو ہوا کا جھونکا ہو گئے تھے۔ میں رک گیا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں ہانپ رہا ہوں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ حارث بن عثمان خاصا پیچھے تھے مگر ہموار قدموں سے اسی طرف آ رہے تھے۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

میں اپنی سانسیں درست کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ چند لمحے بعد حارث مجھ سے آ ملے۔ "بابا عصر کے ساتھ چلنا آسان نہیں ہے اور ان کے ساتھ اندھا دھند دوڑنا

بھی ٹھیک نہیں۔ ایسا آدمی راستہ بھٹک بھی سکتا ہے۔" انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔
"آؤ --- گھر چلیں۔"



میں نے کہانی مکمل کی اور سکون کی سانس لی۔ گھڑی دیکھی، سوا گیارہ بجے تھے۔
میں اس وقت بہت مطمئن تھا۔ سب کام ٹھیک ہو گئے تھے مگر میں اتنی جلدی سونے کا عادی نہیں تھا لہٰذا آنکھوں میں نیند کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ میں سوچتا رہا کہ اب کیا کروں؟ اچانک مجھے بابا عصر کا خیال آگیا۔ میں نے سوچا کہ اب تک کی باتوں کو لکھ لوں۔ ابھی یاد تازہ ہے اس کے باوجود یہ کوئی آسان کام نہیں۔ کوئی اتنا سب کچھ کیسے یاد رکھ سکتا ہے اور ایک دن گزر گیا تو سب کچھ محو ہو جائے گا۔
میں نے پیڈ اپنی طرف کھینچا اور قلم کھولا۔ مجھے ڈر تھا کہ کچھ باتیں اب بھی رہ جائیں گی مگر قلم کھول کر پیڈ کی طرف جھکتے ہوئے جو کچھ ہوا، اس نے مجھے ڈرا دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں تقسیم ہو گیا ہوں۔ میں کمرے میں بھی بیٹھا تھا---- اور میں ایک سڑک پر بابا عصر کے ساتھ چل بھی رہا تھا۔ حارث بن عثمان بھی میرے ساتھ تھے اور بابا عصر کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "پاکستان کی غیر معمولی اہمیت یہ ہے کہ اللہ نے اسے اہمیت دی ہے۔"
میرا قلم کاغذ پر چلنے لگا۔ وہ عجیب تجربہ تھا۔ میں بیک وقت دو جگہ تھا۔ حال کے اس لمحے میں بھی --- اور گزرے ہوئے ان لمحوں میں بھی اور وہ تصور نہیں تھا کیونکہ میری ٹانگوں کو چلنے کا احساس بھی ہو رہا تھا اور تیز چلنے کی وجہ سے میری سانسیں بھی تیز ہو گئی تھیں اور وہ کوئی وڈیو فلم بھی نہیں تھی۔ وہ تو مکمل منظر تھا--- تین جہتوں کے ساتھ بلکہ مجھے چوتھی جہت کی موجودگی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔
میں لکھتا گیا اور لکھنے کے دوران میں مجھے یقین تھا کہ کہیں ایک لفظ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوئی ہے۔
میرا قلم رکا تو میں نے دیکھا کہ تقریباً دو صفحے بھر چکے ہیں۔ میں نے گھڑی دیکھی اور حیران رہ گیا۔ یہ سب کچھ میں نے صرف پندرہ منٹ میں لکھا تھا لیکن حیرت کی

بات یہ تھی کہ میں تھک کر چور ہو گیا تھا۔ ٹانگیں یوں دکھ رہی تھیں جیسے میں میلوں دوڑ لگا کر آیا ہوں۔ پھر جماہی آئی تو اندازہ ہوا کہ مجھے نیند بھی آ رہی ہے حالانکہ اتنی جلدی میں کبھی سوتا نہیں تھا۔
میں نے قلم بند کر کے رکھا۔ اسی وقت ناہید کمرے میں آ گئی۔ "چائے لاؤں تمہارے لئے؟" اس نے پوچھا۔
"نہیں بھئی، مجھے نیند آ رہی ہے۔"
اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "اتنی جلدی تم کب سوتے ہو؟" اس نے کہا پھر خود ہی بولی۔ "اوہ --- کل رات کی نیند بھی تو ہو گی۔"
"ہاں --- یہی بات ہو گی۔" میں نے کہا پھر پوچھا۔ "حارث بن عثمان کیا کر رہے ہیں؟"
"وہ تو آتے ہی سو گئے تھے۔ میں نے دوسرے بیڈ روم میں انہیں سلا دیا ہے۔"
"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔
میں سونے کے لئے لیٹا تو ناہید نے پوچھا۔ "سحری میں تمہیں جگاؤں یا نہیں؟"
"تم جانتی ہو، اب آنکھ کہاں کھلے گی؟"
ناہید نے ملامت بھری نظروں سے مجھے دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں جانتی تھی کہ مجھے جگانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔
لیکن ہوا یہ کہ سحری میں، میں اس سے بھی پہلے جاگا۔ مجھے یاد ہے، میں ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ مجھے احساس ہوا تھا جیسے کسی نے سخت لہجے میں مجھے آواز دی ہے۔ میں اٹھ کر بیٹھا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ناہید اور بچے سو رہے تھے، کمرے میں اندھیرا تھا۔
ایسے کبھی نیند اچٹ جائے تو میں دوبارہ لیٹتا ہوں اور فوراً ہی سو جاتا ہوں۔ اس روز بھی میں نے کوشش کی لیکن آنکھوں میں نیند کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ یہ تو رمضان کا مہینہ ہے--- اور یہ سحری کا وقت ہو گا۔ میں اٹھا اور بیڈ روم سے نکلا۔ لاؤنج میں روشنی کر کے میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ پونے پانچ بجے تھے۔ مجھے جھنجلاہٹ بھی ہوئی اور خود پر شرم بھی آئی۔ مجھے نہ انتہائے سحر کا

وقت معلوم تھا' نہ افطار کا۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ سحری تیار کرنے کے لئے ناہید کس وقت اٹھتی ہے۔

مجھے یاد آیا کہ کچن میں رمضان کے ٹائم ٹیبل والا کارڈ لٹکا ہوا ہے۔ میں نے جا کر دیکھا اور پھر ناہید کو جگا دیا۔ اس بے چاری کو دہری حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔

"تم۔۔۔ تم کیسے اٹھ گئے۔" اس نے مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس آنکھ کھل گئی اور پھر سویا ہی نہیں گیا۔"

گھڑی دیکھ کر وہ اور حیران ہوئی۔ "ٹھیک پونے پانچ بجے میں اٹھ جاتی ہوں۔ آج آنکھ کیوں نہیں کھلی۔"

"میں جو جاگ گیا تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے دانت صاف کئے' منہ دھویا اور کچن میں چلی گئی۔ میں نے حارث بن عثمان کو جگانے کی غرض سے بڑی آہستگی سے دوسرے بیڈ روم کا دروازہ کھولا۔ کمرے میں اندھیرا تھا لیکن وہ جاگ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور انگلیاں تسبیح پر گردش کر رہی تھیں۔ میں نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔ "تم بھی جاگے ہوئے ہو۔"

"جی ہاں' خود بخود آنکھ کھل گئی۔"

"اسی کو خیر و برکت کہتے ہیں برخوردار آفاق۔ یہی اللہ کی تائید ہے۔" وہ بولے۔ "فجر پڑھنے چلو گے نا؟"

"کیوں نہیں۔ انشاء اللہ ضرور چلوں گا۔"

"اللہ تیرا شکر ہے۔"

سحری کے بعد ہم گزشتہ روز کی طرح فجر پڑھنے گئے۔ حارث بن عثمان مسجد میں ہی رہ گئے۔ میں گھر آیا اور سو گیا۔



اس بار بھی میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ کوئی مجھے جھنجوڑ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ میری بیوی ناہید تھی۔ "کیا بات ہے؟ کیا دو بج گئے؟" میں نے بدمزگی سے پوچھا۔

"نہیں ابھی تو نو بجے ہیں۔"

"تو اتنی جلدی کیوں اٹھایا مجھے۔ دفتر تو میں ظہر کے بعد ہی جاؤں گا۔"

"دفتر کے لئے تھوڑا ہی جگایا ہے۔ ادھر تو دیکھو۔۔۔ یہ کیا ہے؟"

میں نے اس کے اشارے کی سمت دیکھا۔ وہ نورانی اشرفیاں تھیں' جو سوتے میں میری جیب سے نکل کر بستر پر گر پڑی تھیں۔ ان پر ناہید کی نظر پڑ گئی تھی۔ اس لئے اس نے مجھے جگایا تھا۔ میں نے دیکھا' اس وقت وہ عام سی اشرفیاں تھیں۔ ان کے اندر سے حروف غائب ہو گئے تھے۔ شاید اس لئے کہ میرا بستر نیچے تھا۔

"یہ اشرفیاں ہیں۔" میں نے سادگی سے کہا لیکن اشرفیوں کو اٹھایا نہیں۔

"بہت قیمتی لگتی ہیں۔ خالص اور بہت اچھی کوالٹی کا سونا ہے۔ تمہیں کہاں سے ملیں؟"

"کسی کی امانت ہیں۔" میں اسے ان کے بارے میں بتانا نہیں چاہتا تھا بلکہ دکھانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ سوچا تھا' چپکے سے کسی بھلے آدمی کو سونپ دوں گا مگر اب وہ انہیں دیکھ چکی تھی پھر بھی میں اسے بہلا سکتا تھا۔ اسی لئے اشرفیاں اس کی موجودگی میں اٹھانا نہیں چاہتا تھا کہ ہاتھ میں آتے ہی حروف ظاہر ہو جائیں گے۔۔۔ اور پھر اسے سب کچھ بتانا پڑے گا۔

"اتنی قیمتی امانت بھی کوئی رکھوا سکتا ہے۔" اس نے حیرت سے کہا اور بالکل اچانک ہی ہاتھ بڑھا کر دونوں اشرفیاں اٹھا لیں۔ اتنا اچانک کہ میں اسے روک بھی

نہیں سکا اور اشرفیاں ہاتھ میں آتے ہی جو حروف چمکے تو وہ بوکھلا گئی۔ اشرفیاں اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گریں اور گرنے سے پہلے ہی عام اشرفیاں بن گئیں۔

"یہ--- یہ کیا ہے؟"

اب اس سے کچھ چھپایا نہیں جا سکتا تھا چنانچہ میں نے اسے پورا ماجرا سنا دیا۔ شروع سے آخر تک۔ وہ حیران ہو کر سنتی رہی۔ پھر اس نے اس بار بڑے اعتماد اور احترام کے ساتھ ان اشرفیوں کو اٹھایا اور انہیں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ اس نے حروف پر انگلی بھی پھیری اور ایک لمحے کو حیران نظر آئی۔ "یہ سونا تو نہیں ہو سکتا۔" اس نے بے حد یقین سے کہا۔ "سونا شفاف نہیں ہوتا جبکہ حروف صاف نظر آ رہے ہیں حالانکہ اشرفی کے اندر ہیں۔"

"بھئی--- میں تو اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"مگر میں دعوے سے کہتی ہوں کہ یہ سونے سے بہت زیادہ قیمتی کوئی دھات ہے۔"

"دھات ہی کیوں؟ ممکن ہے، کوئی اور مادہ ہو۔"

"وزن کی وجہ سے کہہ رہی ہوں۔"

"دھات شفاف کب ہوتی ہے؟" میں نے اعتراض کیا۔

وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔ "پارہ بھی تو دھات ہے۔"

"مگر یہ کوئی نایاب قسم کا بلور--- یا اسی طرح کا کوئی پتھر بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"جو بھی ہے، یہ میں جانتی ہوں کہ ہے بہت قیمتی۔ اتنا قیمتی کہ اس کی قیمت ہمارے تصور سے بھی زیادہ ہو گی۔" اس نے کہا پھر بولی۔ "یہ بتاؤ، اب تم کیا کرو گے اس کا؟"

"کرنا کیا ہے۔ کسی بھلے آدمی کو سونپ دوں گا۔" میں نے نہایت اطمینان سے کہا۔

"وہ تو امانت سونپو گے نا۔ میں تو اس کے بارے میں پوچھ رہی ہوں، جو تمہیں دی گئی ہے۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ واقعی--- یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ مجھے حیرت ہونے لگی۔ ان اشرفیوں کو میرے پاس چوبیس گھنٹے سے زیادہ ہو گئے تھے لیکن میں نے اس انداز میں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سوچا تھا بلکہ میں نے تو مالیت کے حوالے سے بھی نہیں سوچا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ ناہید نے ٹھیک کہا ہے۔ اس کی قیمت ہمارے تصور سے بھی زیادہ ہو گی۔ اتنی زیادہ بھی ہو سکتی ہے کہ کہانیوں کی طرح شہر کا سب سے بڑا جوہری بھی عاجزی سے کہے--- بھئی، اس کی قیمت تو میں اپنی دکان، اپنا محل اور تمام اثاثے بیچ کر بھی ادا نہیں کر سکتا مگر یہاں تک سوچ کر ہی مجھے ہنسی آ گئی۔ وہ اور زمانے کی بات تھی اور وہ بھی کہانیوں میں جبکہ یہ اور دور تھا۔ آج کا جوہری تو کچھ اور ہی ہو گا۔ کہے گا--- میاں، یہ بس دیکھنے ہی دیکھنے کی ہے۔ ڈیکوریشن پیس سمجھ لو۔ سونا تو اس میں سرے سے نہیں ہے۔ کوئی نگ بھی نہیں ہے پھر بھی خوب صورت ہے۔ ایک ہزار اس کے دے سکتا ہوں، مگر مجھے معلوم تھا کہ قیمت کیسے بڑھے گی۔ میں کہوں گا، نہیں بھئی--- مجھے یہ بیچنی ہی نہیں ہے۔ اس پر جوہری ہچکچانے کی اداکاری کرتے ہوئے گویا بولی بڑھائے گا۔ میں انکار کرتا رہوں گا--- اور وہ قیمت بڑھاتا رہے گا۔ وہ کہے گا--- بھئی پانچ لاکھ سے اوپر ایک پیسہ بھی نہیں دے سکتا۔

"نہیں بھئی، مجھے نہیں بیچنی---"

میرے تصور میں موجود جوہری اپنی پیشکش کو کروڑوں تک لے جاتا لیکن میں تصور میں اتنا کھو گیا تھا کہ میں نے یہ آخری مکالمہ بہ آواز بلند کہہ دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میری بیوی گڑبڑا گئی۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو، نہیں بیچو گے اسے؟"

میں چونکا۔ میرا تصور ٹوٹ گیا لیکن پھر بھی میں نے اسی رو میں جواب دیا۔

"نہیں بیچوں گا۔"

"لیکن کیوں؟"

اس ایک لمحے میں میرے اندر یہ احساس ابھرا کہ میں نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ یہ اشرفی بیچنے کی چیز نہیں اور اس احساس کے سامنے میری کیفیت سپردگی کی تھی۔ بلکہ یوں سمجھیں کہ میں نے حتمی طور پر اس بات کا فیصلہ بھی کر لیا تھا لیکن میں جانتا تھا

کہ بیوی کو قائل کرنے کے لئے بہت طاقتور دلائل کی ضرورت ہو گی اور یہ امکان موجود تھا کہ اس کے باوجود وہ قائل نہیں ہو گی۔ تب مجھے اپنی ویٹو پاور استعمال کرنی ہو گی' جو خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنے پاس ہی رکھی تھی۔

مگر ایک لمحے میں میرے دماغ میں ہلچل سی مچ گئی۔ دلائل اتنی تیزی سے ابھرے کہ میں حیران رہ گیا۔ میں نے سر اٹھا کر ناہید کو دیکھا' جو مجھے جواب طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ "بات سیدھی سی یہ ہے ناہید بیگم کہ اگر ایک اشرفی مجھے' میرے لئے نہ دی جاتی تو ابتدا ہی میں اس امانت پر میری نیت خراب ہو جاتی۔ میرے اندر کی مٹی میں پاس امانت اور دیانت داری کا کلا صرف اس لئے پھوٹا کہ ایک اشرفی کی ملکیت کا احساس میرے ذہن میں تھا۔ یعنی ایک اچھی ترغیب موجود تھی۔"

ناہید بہت غور سے میری بات سن رہی تھی۔ "یہ تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تمہاری جگہ میں ہوتی تو میرے ساتھ بھی یہی ہوتا مگر اب نہیں بیچنے کی بات کیوں کہہ رہے ہو؟"

"اب صورتحال بدل جو گئی ہے۔"

"وہ کیسے؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"پاس امانت و دیانت داری کا وہ کلا پودا بن چکا ہے۔ مضبوطی سے جڑ پکڑ چکا ہے۔"

"بہت اچھی بات ہے۔ مقام شکر ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کفران نعمت کیوں کر رہے ہو۔ جب ایک اشرفی تمہارے تصرف' تمہارے اختیار میں دے دی گئی---"

"یہی تو بات ہے۔ اسے میرے تصرف میں' میرے اختیار میں دیا گیا کہ چاہوں تو میں خود رکھ لوں۔ یہ ایک اہم نکتہ ہے۔ یعنی چاہوں تو کسی اور کو دے دوں۔"

"وہ تو ہے لیکن اللہ کی عطا کی ہوئی نعمت سے منہ موڑنا کفران نعمت ہے۔"

"میں کفران نعمت نہیں کر رہا ہوں۔ میں اسے ممکنہ طور پر بہترین مصرف میں لا رہا ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"ابھی میں نے کہا اور تم نے بھی تائید کی کہ اگر ایک اشرفی اپنے لئے نہ ملتی تو میں بے ایمان ہو جاتا۔ اب سوچو کہ صرف امانت والی اشرفی میں کسی اور کی طرف بڑھاؤں گا' یہ کہہ کر اسے وہ اشرفی کسی اور کی طرف بڑھانی ہے تو کیا وہ اس مسئلے سے دوچار نہیں ہو گا؟ کیا اس کی نیت خراب نہیں ہو گی؟ اس کا ایمان بہت بڑی اور سنگین آزمائش سے دوچار نہیں ہو گا؟"

"ہوتا رہے--- یہ تمہارا درد سر تو نہیں ہے۔" ناہید نے بڑی بے رحمی سے کہا۔

"میں اس انداز میں نہیں سوچ سکتا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "تم میری طرح نہیں سوچ سکتیں۔ یہ آزمائش تم پر نہیں آئی۔ تم خطرہ ایمان سے دوچار نہیں ہوئیں۔ میں ہوا ہوں۔ مجھے تو اس شخص کی فکر کرنی چاہئے جو میری وجہ سے آزمائش میں پڑے گا۔ دو وجوہ کے تحت میرے لئے یہ کرنا ضروری ہے۔" میں نے گہری سانس لی۔ "ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ دونوں اشرفیاں مجھے اس نظیر کے ساتھ پہنچی ہیں۔ حارث بن عثمان کو جس نے بھی یہ دی ہوں گی اسی طرح دی ہوں گی مگر انہوں نے اپنے حصے کی اشرفی خود رکھنے کے بجائے میری طرف بڑھا دی اور یہ سلسلہ پیچھے سے اسی طرح چل رہا ہو گا تو مجھے بھی اس کی پیروی کرنی چاہئے۔"

"حارث بن عثمان دنیا دار آدمی نہیں ہیں۔" ناہید نے اعتراض کیا۔

"دنیا سامنے ہو اور آدمی دنیا دار نہ بنے--- موقع ملنے کے باوجود--- تو یہ تو بڑا اعزاز ہے۔ یہ اعزاز مجھے بھی مل رہا ہے۔"

"اب دوسری وجہ بھی بتا دو۔" ناہید نے خشک لہجے میں کہا۔

"دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ پاکستان کے استحکام اور خیر و برکت کی منزل قومی خزانہ ہے۔ انہیں جلد از جلد وہاں پہنچ جانا چاہیے۔"

"بھئی' تم نے کسی کو دی اور اس کی نیت خراب ہوئی تو یہ اس کے پاس رکے گی نہیں' واپس آ جائے گی۔ اسے تو بہرحال اپنی منزل پر پہنچنا ہے۔"

"تم ایک بات بھول گئیں۔" میں نے ملامت بھرے لہجے میں کہا۔ "اس کا سفر جتنا مختصر ہو' جتنی جلدی پورا ہو' اتنا ہی اچھا ہے۔ سفر جتنا طویل ہو گا' ملک و قوم کو

اتنی ہی سختی دیکھنی پڑے گی۔ میں تو چاہوں گا کہ میں جس پہلے آدمی کو یہ دوں' وہ امین ثابت ہو۔ میری تو دعا ہو گی کہ میں یہ اشرفی جسے دوں' اسے بے ایمانی کی ترغیب سے بچانے کا سامان بھی کروں۔"

"جسے بے ایمانی کرنی ہو گی' وہ دونوں اشرفیاں ہضم کرنے کی کوشش کرے گا۔" ناہید نے منہ بنا کر کہا۔

"بہرحال ہمیں تو اتمام حجت کرنا چاہیے۔"

"تو تم یہ دونوں اشرفیاں آگے بڑھا دو گے؟"

"ہاں--- اسی طرح' جیسے یہ میری طرف بڑھائی گئی ہیں۔" میں نے کہا اور اپنی بیوی کو غور سے دیکھا۔ وہ مایوس لگ رہی تھی۔

"مایوس کیوں ہو؟"

"یہ اشرفی ہمارے سارے دلدر دور کر سکتی تھی۔" ناہید نے سوگوار لہجے میں کہا۔

میں مسکرا دیا۔ "اس نے تو ہمارے سارے دلدر دور کر دیئے۔" میں نے کہا۔ "تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔"

"وہ کیسے؟"

"میں اس ڈیڑھ دن میں بہت کچھ سمجھ گیا ہوں بیگم۔ میں نے جان لیا ہے کہ مال و دولت سے دلدر دور نہیں ہوتے۔ خیر و برکت اور اللہ کی تائید و نصرت سب سے بڑی چیز ہے۔ کل یہ اشرفی مجھے ملی اور جانتی ہو' اس کے بعد کیا کیا ہوا۔ میرا روزہ تھا۔ میں سگریٹ نہیں پی سکتا تھا مگر کل کہانی کا وہ پیچ ہی دور نہیں ہوا' زندگی میں پہلی بار میں نے بغیر سگریٹ پیے کام کیا--- اور بہت اچھا کام کیا۔ میں نے کہانی مکمل کر لی۔ آج انشاء اللہ مجھے پیسے مل جائیں گے اور ہماری عید کا سامان بھی ہو جائے گا۔"

وہ اچھل پڑی۔ "کہانی مکمل کر لی تم نے؟"

"جی ہاں جناب!" میں نے اسے دیکھا۔ مایوسی دور ہو گئی تھی اور اس کی آنکھوں میں خوشی اور امید کے دیے جھلملا رہے تھے۔ "یہ تو ایک پہلو ہے خیر و برکت

کا۔ دوسرا تم دیکھ چکی ہو' ہماری ضرورت کی تمام چیزیں کیسے بن مانگے عزت کے ساتھ مل گئیں ہمیں۔"

وہ یک لخت خوش ہو گئی' مسکرانے لگی۔ "ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ میں سمجھ گئی۔ خیر و برکت کے ایک اور اشارے کا تو تمہیں علم ہی نہیں ہے۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "کیا مطلب ہے؟"

"راشن ختم ہو رہا تھا نا۔ میرا اندازہ تھا کہ آج سحری تک بھی شاید نہ چل سکے لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ ابھی تک نیا سامان کھولنے کی نوبت نہیں آئی ہے اور آج تو آئے گی بھی نہیں۔ واقعی--- یہ تو حیرت انگیز برکت ہے۔" یہ کہتے کہتے وہ رونے لگی۔

میں نے اسے لپٹا لیا اور تھپکنے لگا۔ "روتی کیوں ہو پگلی' بیگم!"

"رونے کی بات ہے میں تو خیر و برکت کو تم سے زیادہ سمجھتی تھی مگر مجھے یہ کیا ہو گیا۔ حالات آدمی کو یوں خراب بھی کر دیتے ہیں۔" وہ شرمندگی سے بولی۔

"اللہ تعالیٰ مدد نہ کرے تو آزمائش سے کوئی سرخروئی کے ساتھ نہیں گزر سکتا۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم نے بالکل درست فیصلہ کیا ہے۔ یہ اشرفی کوئی دنیاوی چیز نہیں۔ یہ تو اللہ کی بارگاہ سے کیش ہونے والا چیک ہے تم انہیں جلد از جلد آگے بڑھا دو۔ تم بہت اچھے ہو۔"

"سب اللہ کی طرف سے ہے۔ ہاں سنو---" میں نے اسے پکارا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ "میں ابھی اور کچھ دیر سوؤں گا۔ ظہر کے بعد دفتر جاؤں گا۔ تم کپڑے تیار رکھنا۔"

"بہت بہتر جناب!" وہ مسکرا دی۔ شرمندگی کے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی وہ مسکراہٹ مجھے بہت اچھی لگی۔



اس روز دفتر جاتے ہوئے میں ہر شخص کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ ورنہ عام

طور پر سفر کے دوران میں اپنی سوچوں' اپنے خیالوں میں کھویا رہتا تھا مگر اس روز مجھے ایک ایسے اہل شخص کی جستجو تھی' جسے میں وہ بے حد اہم امانت سونپ سکوں۔

منی بس میں مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ مجھے گھورتا پاکر کچھ لوگ جواباً مجھے گھورنے لگے۔ مجھے اپنی عافیت خطرے میں نظر آنے لگی۔ میں نے نظریں جھکا لیں۔

دفتر تک کے پیدل راستے میں بھی میں اپنی جستجو میں لگا رہا مگر کہیں دل نہیں ٹکا۔ یہاں تک کہ میں دفتر پہنچ گیا۔ کہانی دے کر معاوضہ وصول کرنا ذرا وقت طلب کام تھا۔ میں اس دوران میں حارث بن عثمان کی باتیں یاد کرتا رہا۔ ان کی ایک بات مجھے بہت اہم لگی۔ انہوں نے کہا تھا--- پاکستان کے عام' غریب لوگ بے ایمان نہیں۔ گویا بہتر یہی تھا کہ میں وہ امانت کسی غریب آدمی کے سپرد کر دوں۔

میں دفتر سے نکلا تو بہت خوش تھا۔ میری جیب میں معقول رقم تھی۔ دکان والے کو ادائیگی کرنے کے بعد بھی' ناہید اپنے اور بچوں کے لئے عید کے کپڑے اور ضروری چیزیں خرید سکتی تھی۔ عیدی وغیرہ بھی نمٹ سکتی تھی۔ سو میں بہت خوش اور مطمئن تھا۔ اس خوشی میں مجھے اشرفیاں یاد ہی نہیں رہیں۔ اپنی ذمے داری اور جستجو کا بھی مجھے خیال نہیں آیا۔

عصر کی اذان کی آواز سنائی دی تو میرے قدم خودبخود راستے میں نظر آنے والی مسجد کی طرف اٹھ گئے۔ اس پر مجھے خود بھی حیرت ہوئی۔ پہلے میں اذان سنتے ہوئے گزر جاتا تھا۔ نماز کا خیال بھی نہیں آتا تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اذان کی آواز میں سن کر بھی نہیں سنتا تھا۔

عصر پڑھ کر میں مسجد سے نکلا تو اور مطمئن تھا۔ سکون کا سمندر تھا جو میرے اندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ پہلی بار مجھے پتہ چلا تھا کہ باطن کی حقیقی طمانیت کیا ہوتی ہے۔ ایک عجیب سی سرشاری تھی۔

چلتے چلتے مجھے خیال آیا کہ جیب میں پیسے ہیں تو افطار کے لئے پھل اور بچوں کے لئے کچھ پسندیدہ چیزیں بھی لے لی جائیں مگر میں نے سوچا کہ میرا افطار تک گھر پہنچنا مشکل بھی ہے۔ ایسے میں حارث بن عثمان کا خیال آ گیا۔ وہ بھی تو آئیں گے۔

کتنی بری بات ہو گی کہ میں گھر میں موجود نہیں ہوں گا۔ بس اسی لمحے میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں گھر ٹیکسی میں جاؤں گا--- اور انشاء اللہ افطار سے خاصا پہلے گھر پہنچ جاؤں گا۔

میں بازار کی طرف نکل لیا۔ میں نے پھل خریدے' پھر بچوں کے لئے مکھن' پنیر اور چند دوسری چیزیں خریدیں۔ یہ سامان اٹھائے میں ٹیکسی کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑا رہا تھا کہ مجھے وہ اندھا فقیر نظر آیا--- اور اس کے ساتھ ہی مجھے وہ اشرفیاں یاد آ گئیں۔ میں نے سوچا اس بھکاری سے زیادہ کوئی کیا غریب ہو گا۔ بہتر یہی ہے کہ یہ امانت اسے سونپ دوں۔ نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہئے۔

یہ سوچ کر میں اس اندھے بھکاری کی طرف بڑھ گیا۔



میں گھر پہنچا تو بہت افسردہ اور دل گرفتہ تھا۔ پہلے ہی قدم پر مجھے احساس ہو گیا تھا کہ ذمے داری بہت بڑی ہے۔ پہلا تجربہ ہی بے حد ناخوش گوار تھا۔

لیکن گھر پہنچتے ہی بچوں کی خوشی دیکھ کر سب کوفت دور ہو گئی۔ میں ان کی خوشی میں ایسا خوش ہوا کہ سب کچھ بھول گیا۔ پھر جب میں نے تگڑی رقم ناہید کے ہاتھ پر رکھی تو اس کی آنکھوں میں شکر اور خوشی کے آنسو دیکھنا بھی بہت بڑی طمانیت کا سبب تھا۔ "تم انہیں جس طرح چاہو خرچ کر سکتی ہو۔ دکان والے کے پیسے میں دے آیا ہوں۔" میں نے ناہید سے کہا۔ "اب تو عید ہو جائے گی نا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کچن میں چلی گئی۔

اس شام افطار کے وقت ہمارا دستر خوان اللہ کے فضل و کرم سے بے حد کشادہ تھا مگر ہم سب بے چین تھے اور سب کی بے چینی کا سبب ایک ہی تھا۔ حارث بن عثمان ابھی تک نہیں آئے تھے۔ میں بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔

"ماموں ابھی تک نہیں آئے؟" میرے بڑے بیٹے عبید نے کہا۔

"آ جائیں گے بیٹے۔" ناہید نے اسے تسلی دی۔ مجھے حیرت ہونے لگی۔ انسان کو انسان سے کتنی جلدی انسیت ہو جاتی ہے۔

گھڑی کی سوئیاں حرکت کرتی رہیں۔ اب مجھے لگ رہا تھا کہ حارث نہیں آئیں گے۔ ممکن ہے انہوں نے صرف ایک دن کے لئے ہامی بھری ہو لیکن نہیں، مجھے خوب یاد تھا انہوں نے عید کے دن تک ہمارے ساتھ رہنے کا وعدہ کیا تھا۔

اب افطار میں صرف ایک منٹ رہ گیا تھا۔ اچانک اطلاعی گھنٹی بجی۔ میں نے لپک کر دروازہ کھولا۔ دروازے پر حارث بن عثمان ہی تھے۔ انہوں نے بلند آواز میں سلام کیا۔ ان کے ہاتھ میں کاغذ کی ایک تھیلی تھی۔ "معاف کرنا بچو، مجھے دیر ہو گئی لیکن میں تمہارے لئے جلیبیاں لایا ہوں۔ دکان پر رش بہت تھا۔"

"واہ--- ماموں جلیبیاں لائے ہیں۔" عزیر خوشی سے چلایا۔

ناہید کچن سے پلیٹ لائی۔ جلیبیاں اس میں رکھ دی گئیں۔ اسی وقت مغرب کی اذان شروع ہو گئی۔ افطار کا وقت ہو گیا تھا۔



میں اور حارث عشا اور تراویح پڑھ کر مسجد سے نکلے۔ چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ بابا عصر نے ہمیں آ لیا۔ "ہاں برخوردار آفاق--- میں کیا کہہ رہا تھا؟" انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"آپ ابھی ابھی آئے ہیں بابا عصر!" میں نے بوکھلا کر کہا۔

وہ دھیرے سے مسکرائے۔ "میں کل کی بات کر رہا ہوں۔"

"یہ تو یاد نہیں کہ آپ کیا کہہ رہے تھے لیکن میں نے وہ سب لکھ لیا ہے۔"

"اسے چھوڑو اصل بات یہ ہے کہ مجھے تم کو پاکستان کی اہمیت کے متعلق بتانا ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اللہ نے حق کی نشانیاں چپے چپے پر بکھیری ہوئی ہیں اور اس نے اپنی ہدایت سے عقل کو روشنی دی ہے۔ سو خوش نصیبوں کو چاہئے کہ گردوپیش کو دیکھتے رہیں، تجسس سے مشاہدہ کرتے رہیں تاکہ نشانیوں کو دیکھیں اور انہیں سمجھیں۔"

"جی ہاں، یہ میں سمجھ گیا۔"

"سمجھ گئے تو اب دیکھو اور بتاؤ، پاکستان کی اہمیت کیا ہے؟"

"پاکستان کی اہمیت یہ ہے کہ اللہ نے اسے اہمیت دی۔" میں نے انہی کا کہا ہوا دہرا دیا۔

"اور یہ نتیجہ کیسے نکالا ہم نے؟"

میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ "ہم" کہہ رہے تھے۔ "یہ--- یہ تو آپ ہی بتائیے۔"

"پاکستان کی تخلیق کے لئے اس نے بہت مبارک دن منتخب کیا۔ 27 رمضان--- شب قدر۔ کیا یہ اس کی اہمیت کی دلیل نہیں۔ وہ کوئی اور دن بھی تو ہو سکتا تھا، یہی کیوں؟ وہ رات کہ جس میں قرآن پاک نازل فرمایا۔ اس سے بابرکت کوئی رات ہو سکتی ہے؟"

"جی، بے شک" میں نے پوری سچائی سے کہا۔

"اب اور دلیلیں دو" بابا پھر بولے۔

میں سوچتا رہا۔ ذہن نے اچانک ہی کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ "پاکستان کا قائم رہنا، آپ کی اس بات کی دلیل ہے۔" میں نے کہا۔

"وضاحت کرو۔"

"کیا اپنے کیا پرائے، کیا دوست کیا دشمن، کیا محبت کرنے والے کیا نفرت کرنے والے، سبھی اس کے درپے رہے لیکن یہ خدا کے فضل سے قائم ہے اور انشاء اللہ قائم رہے گا۔"

"اس کی بھی وضاحت کرو۔"

اس وقت بابا عصر مجھے کوئی سخت گیر کلاس ٹیچر لگے لیکن میں بھی اس وقت کلاس کا سب سے ہونہار طالب علم بنا ہوا تھا۔ دماغ جیسے روشن ہو رہا تھا۔ "تقسیم ہند اور تشکیل پاکستان کسی فارمولے کے تحت ہونی تھی اور ہوئی۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "بظاہر فارمولا یہ تھا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گی وہ پاکستان میں شامل ہوں گے لیکن اصل فارمولا کچھ اور تھا اسی لئے بہت سے مسلمانوں کے اکثریتی علاقے پاکستان میں شامل نہیں ہوئے۔ آزاد ریاستوں میں حیدر آباد دکن کو بھارت نے بزور ہڑپ کر لیا اور کشمیر آج تک ایک حل طلب مسئلہ بنا ہوا ہے

حالانکہ درحقیقت وہ تنازع ہے ہی نہیں۔ ضرورت رائے شماری کی ہے۔"

"تو یہ بھی بتاؤ کہ تقسیم ہند کس بنیاد پر کی گئی اور تشکیل پاکستان کس فارمولے کے تحت ہوئی؟"

"تقسیم ہند اس تصور کے تحت کی گئی کہ بالاخر پاکستان کو ختم ہو جانا یعنی خدانخواستہ بھارت میں دوبارہ ضم ہو جانا ہے۔ تشکیل پاکستان کا فارمولا یہ تھا کہ پاکستان کو ان علاقوں سے محروم کر دیا جائے جو وسائل سے مالا مال ہیں' جو اس کی طاقت اور استحکام کا سبب بن سکتے ہیں۔ پاکستان کو وہ علاقے دیئے جائیں جہاں مسائل کی بھرمار ہو۔۔۔ اور جو وسائل سے محروم اور پس ماندہ ہوں۔ تاریخ گواہ ہے کہ زمین اور رقبے سے قطع نظر بھارت اور پاکستان کے درمیان جو وسائل کی تقسیم ہوئی وہ سفاکی کی حد تک غیر منصفانہ تھی۔ پاکستان کو جو فوجی سازوسامان ملا اس کے مطابق پاکستانی فوج کو دنیا کی پس ماندہ ترین فوج ہونا تھا۔ پاکستان میں اقتصادی ڈھانچا سرے سے تھا ہی نہیں۔ صنعت کا وجود ہی نہیں تھا۔ بیشتر بڑے تعلیمی ادارے بھارت میں تھے۔ پھر ستم یہ کہ پاکستان کو جو بہت تھوڑے وسائل ملے وہ بھی بکھرے ہوئے اور غیر منظم تھے جبکہ بھارت کو جو ملا وہ قائم اور منظم تھا۔ وہاں کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پھر مسلمانوں کی ہجرت نے بوجھ ہلکا کر کے انہیں اور مستحکم کر دیا جبکہ یہاں بکھرے ہوئے تنکے تھے جنہیں جمع کر کے آشیانہ بنانا تھا۔ بھارت سیٹ تھا اور پاکستان اپ سیٹ۔ پٹ سن کی پیداوار مشرقی پاکستان میں ہوتی تھی اور اس کی تمام فیکٹریاں مغربی بنگال میں تھیں۔ یعنی پاکستان مجبور تھا کہ اپنی خام پیداوار کوڑیوں کے مول بھارت کو دے جو اس کے ذریعے مصنوعات بنا کر برآمد کر کے بھاری زرمبادلہ کمائے اور مزید مستحکم ہو۔ مختصر یہ کہ سب کچھ برعکس تھا۔ پاکستان کو ابتری ملی تھی اور بھارت کو استحکام۔ پاکستان دنیا کے نقشے پر ایک نئی نوزائیدہ مملکت کی حیثیت میں ابھرا تھا۔ جبکہ بھارت دنیا کے نقشے پر ہمیشہ سے موجود ایک بڑا ملک تھا جو بس آزاد ہوا تھا' قائم بہت پہلے سے تھا۔"

"بہت خوب!" بابا عصر نے چلتے چلتے مجھے ستائشی نظروں سے دیکھا۔ "سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے ورنہ تم لوگ سب کچھ سمجھ سکتے ہو کیونکہ تمہارے اندر گہرائی

میں ہر چیز کی آگہی موجود ہے۔ اچھا' یہ بتاؤ کہ یہ سب کرنے کا مقصد کیا تھا؟"

"اکھنڈ بھارت" میں نے بلا جھجک کہا۔ "ہندو یہ گوارا کر ہی نہیں سکتا تھا کہ بھارت کی سرزمین پر پاکستان بنے۔ اسے تو مسلمانوں سے اپنی ذلت کا حساب لینا تھا۔ باہر سے آنے والے مٹھی بھر مسلمان اتنے بڑے ملک پر چھا گئے تھے۔ اتنی بھاری اکثریت پر غالب آ گئے تھے۔ انہوں نے صدیوں اس بھاری اکثریت پر حکمرانی کی۔ بھاری اکثریت صدیوں محکوم رہی۔۔۔ اور وہ بھی ہنسی خوشی۔ ہندوؤں کے اکابرین نے سمجھ لیا کہ اگر ہندو مسلمان نہ ہوئے ہوتے تو ایسا کبھی نہ ہوتا۔ ان کے انتقام کے منصوبے کا یہ حصہ تھا کہ تمام مسلمانوں کو جو پہلے ہندو تھے' ہندو مت کی طرف واپس لانا ہے۔۔۔ انہیں شدھی کر کے۔ ذلیل کر کے اور ذلیل کرتے رہنا ہے۔ انہیں صدیوں کی محکومی کا قرض چکانا تھا لیکن کچھ مصلحتوں کی وجہ سے انہیں تقسیم پر آمادہ ہونا پڑا۔ پاکستان کو انہوں نے زہر کے گھونٹ کی طرح حلق سے اتارا لیکن انہوں نے انسانی عقل کی حد تک اسے جلد از جلد اگلنے کی ہر ممکن تدبیر بھی کر لی تھی۔ ان کے خیال میں یہ نوزائیدہ ملک فاختہ کی طرح تھا جس کی گھات میں وہ شکرے کی طرح تھے۔ بس وہ یہ بھول گئے کہ وہ شکرا نہیں' گدھ ہیں۔۔۔ مردار خور گدھ جو زندہ کو شکار کر ہی نہیں سکتا۔

پاکستان کی تشکیل میں ہندوؤں نے اپنی سب عیاریاں آزما ڈالیں۔ ان کا اندازہ تھا کہ یہ مملکت اپنی بے سروسامانی اور ابتری کے سبب سے بہت تھوڑے عرصے میں خود ان کے قدموں میں آ گرے گی لیکن وہ جذبے کی اہمیت اور طاقت سے ناواقف تھے۔ پاکستان میں رہنے والے اتنی تیزی سے پاکستان قوم بنے اور ان میں اتنی شدت سے جذبہ تعمیر ابھرا کہ دیکھتے ہی دیکھتے تنکے ایک خوب صورت اور پرسکون آشیانے کی صورت اختیار کرنے لگے۔ ہندو قیادت کو اندازہ ہو گیا کہ یہ مملکت خود زیر ہونے والی نہیں۔ بہرحال تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ ان کے پاس بھاری اور منظم فوجی طاقت تھی۔ انہوں نے سوچا کہ بزور اکھنڈ بھارت بنا دیں گے مگر پہلے چیک کرنا ضروری تھا۔ اپنی طاقت اور پاکستان کی کمزوری کی پیمائش کے لئے ان کے پاس آلہ موجود تھا۔۔۔ کشمیر۔ انہوں نے وہاں جارحیت کی لیکن جو نتیجہ نکلا' اس نے انہیں

حیران کر دیا۔ ایک مرحلے پر تو ایسی صورحال تھی کہ کشمیر کا مسئلہ ختم ہونے کو تھا چنانچہ بوکھلایا ہوا نہرو بھاگا اور امریکا کی گود میں بیٹھ کر فریاد کرنے لگا۔ امریکا نے اس کے حق میں تصفیہ کرا دیا۔ اکھنڈ بھارت کا خواب تو دھرا رہ گیا اپنا وجود بھی خطرے میں پڑ گیا۔"

"بس--- آج کے لئے اتنا کافی ہے۔" بابا عصر نے کہا۔ "اب مجھے جانا ہے لیکن ایک کام اور ہے۔ اشرفی کے سفر کا ایک مرحلہ میں تمہیں سناؤں گا اور تم اسے لکھو گے۔"

مجھے بہت حیرت ہوئی۔ "میں تو وہ ویسے بھی لکھ سکتا ہوں' میں اس کا مرکزی کردار ہوں۔"

"لیکن بہت کچھ ایسا ہے جو تمہیں بھی معلوم نہیں۔ ویسے بھی اشرفی کا سفرنامہ آخر تک میں ہی بیان کروں گا۔"

"ٹھیک ہے بابا عصر۔"

اس کے بعد بابا عصر بولتے رہے اور میں سنتا رہا۔ حیرت سے میری آنکھیں پھیلتی گئیں' آخر میں بابا عصر نے کہا۔ "یاد رکھو سود کا لین دین یہود کی بیماری ہے جبکہ اللہ اسے سخت ناپسند کرتا ہے مگر اللہ کی سختی سے حکم دینے کے باوجود یہود نے اسے ترک نہیں کیا۔ یہ ان کی معزولی کے اسباب میں سے ایک ہے۔"

"جی۔ میں سمجھ گیا۔"

"اور مسلمانوں کی وضع قطع' ان کا طرز زندگی و بود و باش' ان کا کردار' ان کے اعمال--- سب کچھ مسلمانوں کا سا ہونا چاہئے۔ ویسا جیسا اللہ چاہتا ہے۔ ان کو کسی بھی اعتبار سے کفار سے یا یہود و نصاریٰ سے مشابہ نہیں ہونا چاہئے۔ مشابہت پیدا کی تو نتیجہ کبھی اچھا نہیں نکلے گا۔ اچھا--- اب میں چلتا ہوں۔"

میں بابا عصر کو نگاہوں سے اوجھل ہوتے دیکھتا رہا۔ یہ آخری بات بہت اچھی طرح میری سمجھ میں آ گئی تھی۔



اس رات میں اشرفی کا سفر لکھنے بیٹھا۔ اس بار بھی وہی ہوا۔ میں اپنی اسٹڈی

میں بھی تھا اور اس فٹ پاتھ پر بھی۔ بابا عصر کی آواز بھی مجھے سنائی دے رہی تھی اور ایک اور--- بے حد انوکھا تجربہ بھی ہوا۔ میں جیسے اس اندھے فقیر کو آرپار بھی دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی سوچیں' اس کے خیالات پڑھ سکتا تھا۔

میں نے لکھنا شروع کر دیا۔



وہ بس نام کا فقیر تھا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ بھکاری تھا۔ اسے شکایت یہ تھی کہ اس کا نام کوئی ٹھیک سے نہیں لیتا۔ اسے سب فقیرا کہتے تھے۔ حتیٰ کہ گھر میں بیوی بھی اسے او فقیرے کہہ کر بلاتی تھی' فقیرے کو او' پر اور بیوی کے طرز تخاطب پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس کا تو وہ عادی تھا۔ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر بھیک مانگنے والے کو آپ جناب کہہ کر لاکھوں میں کوئی ایک ہی مخاطب کرتا ہے اور وہ بے چارہ اپنی ہی عزت کھو بیٹھتا ہے۔ فقیرے کو بس یہ آرزو تھی کہ کوئی اسے--- سن بھئی فقیرے حسین--- کہہ کر پکارے لیکن اس سلسلے میں اس کا زور اپنی بیوی پر بھی نہیں چلتا تھا۔

فقیرا ان دنوں کچھ پریشان تھا۔ رمضان گزرا جا رہا تھا۔ آج 28 واں روزہ تھا مگر یہ پورا مہینہ بڑا مندا گیا تھا۔ گزشتہ روز اس نے حساب لگایا تو اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس رمضان میں یومیہ کمائی کا اوسط بمشکل 1200 روپے بنتا تھا جبکہ عام دنوں میں بھی اس کا دھندا کبھی تین ہزار روپے روز سے کم نہیں ہوتا تھا۔ پچھلے رمضان میں تو اس نے دو لاکھ سے اوپر پیٹا تھا مگر اس بار تو حد ہی ہو گئی تھی۔ رمضان کا گراف عام مہینوں سے بھی نیچے آ گیا تھا۔ پتہ نہیں' کیا ہوتا جا رہا ہے اس دور کے مسلمانوں کو۔ فقیرے نے نہایت دکھ سے سوچا۔ اب تو خیرات اور زکواۃ سے بھی دور ہوتے جا رہے ہیں۔

"کیا حال ہے بے فقیرے؟"

کانسٹیبل مولا داد کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے سر اٹھا کر ناپسندیدہ نظروں سے مولا داد کو دیکھا۔ "تو عصر' مغرب کے درمیان اپنا چہرہ نہ کرایا کر مجھے۔" اس نے

بہت بدمزگی سے کہا۔ "یہ وہ وقت ہوتا ہے جب تیرے چہرے پر پھٹکار اور نحوست کی حد ہو جاتی ہے۔ ایسے میں تیری صورت دیکھ کر اپنا تو دھندا ہی چوپٹ ہو جاتا ہے۔"

مولا داد نے اس کی بات کا مطلق برا نہیں مانا۔ تھانے میں جانے والے بھتے کے علاوہ بھی وہ اسے روز دس بیس روپے دے دیتا تھا چنانچہ اس نے بڑی حلیمی سے کہا۔ "میں پوچھ رہا ہوں' کیا حال ہے تیرا؟ دھندا کیسا چل رہا ہے فقیرے؟"

"دھندا!" فقیرے نے دل دوز آہ بھر کے کہا۔ "اس بار تو رمضان میں فاقے کر رہا ہوں۔"

مولا داد بدتمیزی سے ہنسنے لگا۔ "واہ--- کیا بات کہی ہے فقیرے رمضان میں فاقے۔ کتنا بدنصیب ہے تو۔ ابے روزہ ہی رکھ لیا کر۔" پھر اس نے فقیرے کے تیور بدلتے دیکھے تو جلدی سے موضوع بدلا۔ "یہ بتا' تجھے اس وقت میرے چہرے پر پھٹکار کیوں نظر آتی ہے؟"

فقیرے نے اس کے ہاتھ میں موجود شاپنگ بیگ کو نفرت سے دیکھا' جس میں سے دنیا بھر کے پھل نکل پڑ رہے تھے۔ "یہ جو تو بھتے کے علاوہ افطار وصول کرتا ہے' غریب پھل فروشوں سے تو پھٹکار اور نحوست تو برسے گی ہی۔"

"ایس ایچ او کا حکم ہے' میں کیا کروں اور یہ پھل تو اس سے بھی آگے بڑے بڑے افسروں کو جاتے ہیں۔" مولا داد نے شرمندگی سے کہا۔ "مجھے تو مشکل سے ایک کھجور اور ایک کیلا ملتا ہے اور کبھی کبھی تو کیلا ملتا ہی نہیں۔"

"اچھا چل' اب آگے بڑھ۔" فقیرے نے اسے ڈپٹا۔" زیادہ نحوست نہ پھیلا دھندے کے ٹیم۔"

مولا داد ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔ فقیرا صدا لگانے ہی والا تھا کہ تیرا اس کے پاس آ بیٹھا۔ وہ فقیرے کا بیٹا تھا۔ نام اس کا تنویر تھا لیکن پیار میں اسے تیرا کہا جاتا تھا۔

"تو یہاں کیا کر رہا ہے بیٹے!" فقیرے نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"دھندا نہیں ہے ابا۔ میں بور ہو کر تمہارے پاس چلا آیا۔" بس میں دھکے کھانا اچھا نہیں لگتا۔ تمہارے ساتھ ہی گھر چلوں گا گاڑی میں۔"

فقیرے کا موڈ آف ہو گیا۔ "ابے دھندا نہیں ہے تو کیا ہوا۔ ٹھئے پر بیٹھے گا تو

مستقبل بنے گا۔ یوں بھاگنے سے تو دھندا اور خراب ہو گا۔"

"میرا دل نہیں لگتا ابا۔ پتا ہے' دن بھر میں چار سو روپے بھی نہیں ملے۔ اس سے زیادہ تو میں تم سے جیب خرچ لے لیتا تھا۔" تیرے نے شاکی لہجے میں کہا۔

"اب پتہ چلا کہ آپ کمائی اور باپ کی کمائی میں کتنا فرق ہے۔" فقیرے نے کہا اور تنقیدی نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔ "اور اب تیرے ہاتھ کو کیا ہوا؟"

تیرا بوکھلا کر اپنے ہاتھ ٹٹولنے لگا۔ "کچھ نہیں ابا' ٹھیک تو ہے۔"

"ابے الو کے پٹھے! یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ یہ ٹھیک کیوں ہے۔ اسے موڑ جلدی سے' ٹنڈا بن فٹافٹ۔"

"ابا' اس وقت میں ڈیوٹی پر نہیں ہوں۔" تیرے نے برا مانتے ہوئے کہا۔ "میں آف کر کے آیا ہوں۔"

"دیکھ بھئی' ابھی تو اپرنٹس ہے۔ ڈیوٹی پر ہو یا نہ ہو' ڈیوٹی ٹائم تک گیٹ اپ خراب نہ کیا کر۔" فقیرے نے سمجھایا۔ "اب تو اسی طرح یہاں بیٹھے گا تو میرا دھندا بھی خراب ہو گا۔"

تیرے نے سعادت مندی سے باپ کے بتائے ہوئے طریقے پر ہاتھ کو بل دیا اور ٹنڈا بن گیا۔

فقیرے نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ خوش تھا کہ بیٹے سعادت مند ملے ہیں۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ تعلیم مکمل کرانے کے بعد اس نے تینوں کے لئے ٹھئے خرید کر انہیں دھندے پر بٹھا دیا تھا۔ انہوں نے تھوڑا سا احتجاج کیا تھا کہ اتنی دولت ہوتے ہوئے وہ بھیک کیوں مانگیں۔ اس پر فقیرے نے ڈپٹ کر کہا تھا۔ "یہ دولت بھیک ہی کے دم سے ہے۔"

"مگر اب ہے تو بھیک مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟" بڑے بیٹے نے اعتراض کیا۔

"دولت آتی مشکل سے ہے اور جاتی آسانی سے ہے۔" جنہیں کمانا نہیں آتا' وہ تو برسوں کی کمائی ہوئی دولت دنوں میں اڑا دیتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ میری زندگی میں ہی اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ۔"

"لیکن ابا' ہم پڑھے لکھے ہیں۔" منجھلا بیٹا بولا۔

"بھیک کے پیسوں سے ہی پڑھے ہو۔" فقیرے نے تیز لہجے میں کہا۔ "اس سے اچھا دھندا نہیں ملے گا تمہیں۔"

"ہم یہ کام نہیں کر سکتے۔" تینوں بیٹوں نے بیک آواز کہا۔

"تو نہ کرو کل سے جیب خرچ بھی بند اور گھر میں کھانا بھی نہیں پکے گا۔ بھوکے مرو گے تو دماغ ٹھیک ہو جائے گا۔"

اور لڑکوں کا دماغ فوراً ہی ٹھیک ہو گیا لیکن بڑے بیٹے نے کہا۔ "کوئی بات نہیں ابا تمہاری زندگی میں نہ سہی، تمہارے مرنے کے بعد سب کچھ ہمارا ہو گا۔ ہم اپنی مرضی کی زندگی گزار سکیں گے۔"

فقیرا اس کی روک تھام پہلے ہی کر چکا تھا۔ بلکہ وہ تو یہ بھی جانتا تھا کہ لڑکے اس مقصد کے حصول کے لئے اس کی جان بھی لے سکتے ہیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ایسا نہیں ہو گا۔ میں وصیت نامہ لکھوا چکا ہوں۔ میرے مرنے کے بعد بھی یہ سب کچھ تمہارا نہیں ہو گا۔ ہاں، میری موت کے بعد جو دس سال تک ہر روز بلاناغہ دوپہر بارہ بجے سے رات آٹھ بجے تک یہ دھندا کرے گا، وہ میری دولت کا حق دار ہو گا۔ تم تینوں نے یہ شرط پوری کر دی تو میری تمام دولت تینوں میں تقسیم ہو جائے گی ورنہ شہر بھر کے تمام بھکاریوں میں تقسیم ہو جائے گی۔"

لڑکوں کے سارے کس بل نکل گئے اور وہ تیر کی طرح سیدھے ہو گئے۔ فقیرا جانتا تھا کہ کروڑوں کی دولت چھوڑنے کا حوصلہ کسی میں بھی نہیں۔

"ابا۔۔۔ مجھے ایک بائیک ہی دلا دو۔"

تیرے کی فرمائش فقیرے کو حال میں واپس لے آئی اس نے بیٹے کو غور سے دیکھا۔ "تو اپنی کمائی سے ہیلی کاپٹر خرید لے بیٹے اور اس میں دھندے پر آیا کر اور گھر جایا کر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" اس نے بے حد شفقت سے کہا۔ "لیکن مجھ سے سائیکل کی امید بھی نہ رکھ۔ اچھا، اب چپ ہو جا، کوئی دیالو آ رہا ہے۔" اس نے آہٹ کی سمت دیکھا تو اسے وہ شخص آتا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں دو شاپنگ بیگ تھے جن میں پھل اور دوسری چیزیں تھیں۔

فقیرے نے تیزی سے اپنی آنکھوں میں بے نوری کا تاثر ابھارا۔ "اے داتا،

اندھے فقیرے کو کچھ دے دے۔ دو روز سے بے سحری اور افطار کے ہوں۔"

تیرا دل میں اش اش کر اٹھا وہ جانتا تھا کہ ابا سچا ہے بلکہ یہ انڈر اسٹیٹ مینٹ تھا۔ ابا 28 سحریوں اور 27 افطار سے محروم تھا۔ اس لئے کہ سحری میں وہ اٹھتا نہیں تھا اور افطار کے وقت گھر کے راستے میں ہوتا تھا مگر وہ دعویٰ دو روز کا کر رہا تھا۔ تیرے کا دل بھر آیا۔ اس کا جی چاہا کہ جیب میں جو کچھ ہے، ابا کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں رکھ دے۔

آنے والا رکا اس نے فقیرے کے ہاتھ پر دس کا نوٹ رکھ دیا۔ "لو۔۔۔ آج اچھی طرح افطار کر لینا۔"

"دس آدمیوں کا کنبہ ہے داتا۔ اس میں کیا اچھی طرح افطار ہو گا۔" فقیرے نے بے حد عاجزی سے کہا۔

آنے والے نے اس بار سو کا نوٹ نکال کر اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔ "بابا۔۔۔ میں تمہیں کچھ اور بھی دینا چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔

"میں حاضر ہوں دیالو۔ جو بھی دے دو، کم ہے۔"

"کچھ بتانا سمجھانا بھی ہے۔ میں یہاں بیٹھ جاؤں؟"

"بیٹھ جاؤ داتا۔ اللہ کی زمین ہے، میں کون روکنے والا۔ بس یہاں بیٹھ کر دھندا میرا سگا بیٹا بھی نہیں کر سکتا۔"

آنے والا ایک لمحے کو حیران نظر آیا پھر وہ وہیں اکڑوں بیٹھ گیا۔ "میرا نام آفاق ہے۔ دو دن پہلے اللہ کی بڑی عنایت ہوئی مجھ پر۔ مجھے ایک امانت دی گئی اور حکم ہوا کہ وہ کسی امین اور دیانت دار شخص کو پہنچا دوں، جو اسے آگے بڑھا دے۔"

تیرے کا جی چاہا کہ اس شخص کو خبردار کر دے کہ وہ غلط جگہ آ گیا ہے لیکن عاق ہو جانے کے ڈر سے چپ رہا۔

"ضرور دو داتا۔"

آفاق نے جیب سے دونوں اشرفیاں نکال کر اس کی طرف بڑھا دیں۔ "ان میں ایک پر تمہارا اختیار ہے، جی چاہے تو رکھ لینا۔"

"دوسری بھی مجھے دے دو نا؟" فقیرے نے گھگیا کر کہا۔

"نہیں یہ وہ اللہ کی امانت ہے اور تمہیں کسی اور امین اور دیانت دار کو سونپنی ہے--- انہی ہدایات کے ساتھ جو میں تمہیں دوں گا---" وہ اسے اشرفیوں کی اہمیت سمجھانے لگا۔

اسی وقت فقیرے کو افضل نظر آ گیا' وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ "ایک منٹ بابو' میں ذرا اس سے بات کر لوں۔ پھر تمہاری سنوں گا۔" اس نے اشرفیاں لبادے کی جیب میں ڈال لیں۔ افضل نے آکر کچھ نوٹ فقیرے کو دیئے۔ فقیرے نے انہیں گنا اور سخت لہجے میں بولا۔ "یہ تو صرف سات سو ہیں۔"

"ہاں بھائی یہ بھی بڑی مشکل سے لایا ہوں۔ بچوں کے کپڑے بھی نہیں بنے اس عید پر۔" افضل نے کہا۔

"کوئی بات نہیں اگلی عید پر بنا لینا۔" فقیرے نے بے پرواہی سے کہا۔ "مگر مجھے تین سو اور دو۔"

"نہیں ہیں نا استاد۔ ہیں ہی نہیں۔" افضل گڑگڑانے لگا۔ آفاق حیرت سے کبھی اسے دیکھتا تھا اور کبھی فقیرے کو۔

فقیرے نے افضل کا گریبان پکڑ لیا۔ "دیکھ بھئی' ایسے تو میرا دھندا چوپٹ ہو جائے گا۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ اصل بھلے نہ دے لیکن ہر مہینے سود دینے میں ناغہ نہ کرنا اور تو پہلے ہی مہینے یہ گڑبڑ کر رہا ہے۔ دیکھ تجھ سے تو میں سو پر بیس لے رہا ہوں۔ آج ایک ضرورت مند آیا تھا' پانچ ہزار مانگ رہا تھا۔ میں نے کہا سو پر پچیس لوں گا۔ وہ راضی ہو گیا۔ میں نے کہا' ضرورت پانچ کی ہے تو سات لینا پڑے گا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے بتایا کہ سات ہزار پر سود ہوا پونے دو ہزار۔ وہ نکال کر بچیں گے سوا پانچ چاہو تو سوا پانچ لے لو ورنہ 250 روپے اگلے مہینے کے سود میں کٹوا دو۔ ابھی سے۔ بہت خوش ہو کر گیا بے چارہ۔ دعائیں دے رہا تھا مجھے۔ پر تم لوگ ایسا کرو گے میرے ساتھ تو دوسرے ضرورت مندوں کا نقصان ہو گا۔ میں انہیں کہاں سے دوں گا۔ میں تو غریب بھکاری ہوں میرے پاس کوئی قارون کا خزانہ ہے۔"

اس کا لہجہ بدل گیا۔ "نکال تین سو روپے اور۔"

ابھی تو نہیں ہے فقیرے بھائی۔ کل کہیں سے کروں گا تو لا کر دوں گا۔"

"بس لے آئیو کل۔ ورنہ گھر آ کر بے عزت کروں گا۔" فقیرے نے گرج کر کہا۔ "بس اب چلا جا۔"

افضل چلا گیا تو فقیرا آفاق کی طرف مڑا' جس کے انداز سے لگتا تھا کہ اسے قے ہونے والی ہے۔ "ہاں تو بابو' تمہاری بات میں سمجھ گیا۔ تمہارا کام ہو جائے گا۔"

"میرا نہیں' اللہ کا کام۔" آفاق نے جلدی سے تصحیح کی۔ "مگر تم تو سود کا کاروبار کرتے ہو؟"

"کاروبار کیا' ضرورت مندوں کے کام آتا ہوں۔" فقیرے نے عاجزی سے کہا۔

"مگر یہ تو سود ہے۔"

"تو یہاں کون ہے جو سود نہیں لیتا دیتا۔ تم بینک میں پیسہ جمع کراتے ہو تو تمہیں سود ملتا ہے۔ بینک سے قرضہ لیتے ہو تو تمہیں سود دینا پڑتا ہے۔ جاؤ پکڑو سب کو مجھ منگتے کو کیوں پکڑتے ہو۔"

"بینک کی باتیں حکومت والے جانیں۔ میں تو خود کو اور تمہیں دیکھوں گا۔ تمہیں اس لئے اللہ کی امانت نہیں سونپ رہا ہوں۔"

فقیرے کا موڈ خراب ہونے لگا۔ "یہ سب چھوڑو کام کی بات کرو۔" اس نے بے رخی سے کہا۔ "یہ بتاؤ' اس اشرفی کی قیمت کتنی ہو گی؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" آفاق نے کہا۔ "لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"کوئی اس کے پانچ سو بھی نہیں دے گا لیکن میں ایک لاکھ بھی دے دوں گا صرف اس لئے کہ نوادرات جمع کرنے کا شوق ہے مجھے۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"دیکھو' ایک تو ویسے ہی میری ہو گئی ہے نا۔ اور میں یہ نہیں چاہتا کہ دوسری بھی کسی اور ناقدرے کے پاس جائے۔ میں وہ بھی رکھنا چاہتا ہوں۔"

"تم امین اور دیانت دار ہو ہی نہیں سکتے۔ سود کا کاروبار بھی کرتے ہو۔" آفاق نے غصے سے کہا۔

"دیکھو' میرے کاروبار سے تمہارا واسطہ نہیں اور بددیانت اور خائن میں ہوں نہیں۔ ہوتا تو دوسری اشرفی بھی یونہی رکھ لیتا۔ کوئی کیا بگاڑ لیتا میرا لیکن اس میں اللہ

کا نام ہے اس لئے میں نے سوچا ہے کہ دوسری اشرفی ایک لاکھ میں خریدوں گا اور وہ ایک لاکھ روپے اپنے جیسے کسی امین اور دیانت دار کو تھما دوں گا انہیں آگے بڑھا دے۔"

"یہ خیانت نہیں ہے تمہارے خیال میں؟" آفاق غصے میں آپے سے باہر ہونے لگا۔ "تمہیں وہ اشرفی آگے بڑھانی ہے۔"

"میں اس کی ناقدری نہیں کرنا چاہتا اور دیکھو' پانچ سو کی چیز میں ایک لاکھ میں خرید رہا ہوں' یہ خیانت ہے؟"

"تم امانت کا مطلب بھی نہیں سمجھتے۔ کیسے سمجھو گے' سود کھاتے ہو' اندھے نہیں ہو' ہٹے کٹے ہو کر بھیک مانگتے ہو۔ جھوٹ بے تحاشا بولتے ہو۔ تم تو اس نعمت کے اہل ہی نہیں ہو۔ لاؤ' وہ اشرفیاں مجھے واپس دے دو۔ میں انہیں کسی اچھے دیانت دار شخص کو سونپوں گا۔"

"ارے واہ۔۔۔ اشرفیاں تو اب تمہیں نہیں مل سکتیں۔"

"میں زبردستی لے لوں گا۔" آفاق نے آستینیں چڑھاتے ہوئے کہا۔

"ویسے تو میں تمہارے ایک ہاتھ جڑ دوں تو ابھی تمہارا روزہ ٹوٹ جائے گا پھر یہاں میرا جوان اور مجھ سے زیادہ ہٹا کٹا بیٹا بھی بیٹھا ہے لیکن سب سے آسان بات یہ ہے کہ میں شور مچا دوں کہ تم اندھے فقیر کو لوٹ رہے ہو۔ میرا بیٹا گواہی دے گا اور لوگ تمہاری چٹنی بنا دیں گے۔ پھر پورا تھانہ مجھے جانتا ہے رات بھی حوالات میں گزارنی پڑے گی۔ بہتر یہی ہے کہ ٹھنڈے ٹھنڈے چل دو یہاں سے۔"

آفاق کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ بے بس ہو چکا ہے۔ اس کا دل شرم' رنج اور تاسف سے بھر گیا۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں۔

"جا بابو' چلا جا یہاں سے۔" اندھے فقیرے نے کڑک کر کہا۔ "یا پھر میں مچاؤں شور۔"

آفاق گھبرا کر وہاں سے ہٹ آیا۔ اسی وقت اسے ایک ٹیکسی گزرتی نظر آئی۔ اس نے اشارہ دے کر ٹیکسی کو روکا اور اس میں بیٹھ گیا مگر اس کا دل اور روح بوجھل تھے۔ وہ ایک بے حد قیمتی چیز بہت برے آدمی کے پاس چھوڑے جا رہا تھا۔

مگر ٹیکسی میں بیٹھ کر جب اسے یہ خیال آیا کہ اس امانت کی حفاظت اللہ کو کرنی ہے نااہل آدمی کے پاس وہ اشرفیاں رکیں گی نہیں' اس کے پاس واپس آ جائیں گی تو اس کا بوجھ قدرے کم ہو گیا لیکن شرمندگی رہ گئی۔ وہ سوچ رہا تھا۔۔۔ کوئی مسلمان' کوئی پاکستانی ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

گھر پہنچ کر اس نے بڑی امید کے ساتھ اپنی جیبیں ٹٹولیں اسے مایوسی ہوئی' اشرفیاں ابھی تک اس کی جیب میں واپس نہیں آئی تھیں۔



تنویر عرف تیرا دیکھ رہا تھا کہ اشرفیاں ملنے کے بعد ابا کی کیفیت کچھ بدل گئی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ فقیرا بہت بے چین اور مضطرب تھا۔ دھندے میں تو اس لمحے کے بعد اس نے دلچسپی لی ہی نہیں۔ وہ تو بار بار جیب میں ہاتھ ڈال کر ان اشرفیوں کو چھوتا تھا۔ چہرے کے تاثر سے لگتا تھا کہ انہیں نکال کر دیکھنا چاہتا ہے لیکن اشرفیاں اس نے ایک بار بھی جیب سے نہیں نکالیں۔ جیسے وہ ڈرتا ہو کہ کوئی انہیں چھین لے گا۔

دو ایک راہ گیر اس کے سامنے فٹ پاتھ پر سکے گراتے ہوئے گئے لیکن اس نے سکوں کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ورنہ ہمیشہ وہ ان پر یوں جھپٹتا تھا جیسے ان پر اس کے جینے کا انحصار ہو۔ یہ حرص اس کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی۔

تیرے نے ابا کو اس حال میں--- دھندے سے بے خبر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ موقع مناسب دیکھ کر اس نے اپنا ٹنٹے کا گیٹ اپ ختم کر دیا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے ایکٹنگ کرنے والے ہاتھ کو سہلاتا رہا۔ گیٹ اپ بڑا تکلیف دہ تھا۔ ہاتھ سیدھا کرنے کے بعد بھی پوری طرح سیدھا نہیں ہوتا تھا اور اس میں اینٹھن بھی ہوتی رہتی تھی۔ ڈیوٹی آف کرنے کے بعد سے سونے تک وہ اس ہاتھ کو سہلاتا رہتا تھا۔ کبھی تو اسے ڈر لگنے لگتا تھا کہ اس کا یہ ہاتھ بے کار ہی ہو جائے گا۔

اونچی ایڑیوں کے سینڈلوں کی کھٹ کھٹ سنائی دی تو تیرے نے بے چین ہو کر آہٹ کی سمت دیکھا۔ اس کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ وہ لڑکی بے حد حسین تھی اور بے نیازی سے پرس جھلاتی ہوئی اسی طرف چلی آ رہی تھی۔ اس کی چال میں دل ربائی تھی۔ تیرا بڑی وارفتگی سے اسے تکتا رہا۔ جان من نظریں تو اٹھاؤ۔ تمہیں تمہارے بے مثال حسن کی قسم۔ تیرے نے دل میں اسے پکارا۔ لڑکی

کے ہر بڑھتے قدم کے ساتھ اس کی پکار کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر شاید وہ شدت اثر کر گئی۔ بہت قریب آکر لڑکی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا مگر وہ دیکھنا غضب ہو گیا۔ وہ اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ کوئی بیمار کتا ہو۔ اس کی نگاہوں میں ترحم ابھرا۔ وہ رکی' اس نے پرس کھول کر اس میں سے روپے کا ایک نوٹ نکالا۔ پھر چند لمحے وہ باری باری فقیرے اور تیرے کو تکتی رہی' جیسے فیصلہ نہیں کر پا رہی ہو کہ نوٹ کسے دیا جائے۔ تیرے نے جلدی سے ابا کی طرف دیکھا مگر وہ اپنے آپ میں اور ان اشرفیوں کے سحر میں گم تھا۔ تیرے نے سکون کی سانس لی۔

بالآخر لڑکی نے فیصلہ کر لیا اور روپے کا نوٹ تیرے کی طرف بڑھایا لیکن تیرے نے نوٹ کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ "اس پر اپنے آٹوگراف دے دو مس صاحبہ!" اس نے سرگوشی میں کہا۔ "بلکہ ایڈریس بھی لکھ دو۔"

وہ سرگوشی پورے لفظوں اور مفہوم کے ساتھ لڑکی تک نہیں پہنچ سکی۔ "کیا کہہ رہے ہو؟" وہ بولی۔

تیرے نے کن انکھیوں سے ابا کو دیکھا اور سرگوشی کا والیوم ذرا بڑھا دیا۔ اس کے نتیجے میں اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ اس نے کہا۔ "تم کو جھکنا پڑے گا مس صاحبہ میری آواز اس سے زیادہ نہیں نکل سکتی۔"

لڑکی اس کی طرف جھکی تو تیرے پر قیامت گزر گئی۔ پھر بھی اس نے دل کی بات کہہ ہی دی۔ پھر اسے کچھ خیال آیا تو اس نے اضافہ کیا۔ "لیکن یہ نوٹ چھوٹا ہے میں جیب سے سو کا نوٹ نکالتا ہوں۔ ایک طرف آٹوگراف اور دوسری طرف ایڈریس دے دو۔"

"آٹوگراف!" لڑکی نے برہمی میں لپٹی ہوئی حیرت سے دہرایا۔ "اے' تم بھک منگے ہو یا لفنگے؟" اس نے بے حد خراب لہجے میں کہا۔ "مجھے کیا سمجھا ہے تم نے؟"

اس دوران میں تیرا جیب سے سو کا نوٹ نکال چکا تھا۔ لڑکی کا ایک کا نوٹ بھی اس کے ہاتھ میں تھا لیکن لڑکی کے تیور دیکھ کر وہ بوکھلا گیا۔ ابا کے ٹھیے پر گڑبڑ ہو گئی تو ابا عاق ہی کر دے گا۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے کہا۔ "آپ--- آپ فلم اسٹار میرا نہیں ہیں؟"

یہ سن کر لڑکی مسکرائی پھر اس کی مسکراہٹ ہوا ہو گئی اور اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ "ایسی میری قسمت کہاں؟" اور یہ کہہ کر وہ ست قدموں سے آگے بڑھ گئی۔

تیرا اس کے جملے پر غور کرتا رہا۔ کیا واقعی میرا ہونا خوش نصیبی کی بات ہے مگر وہ اس بات پر زیادہ دیر غور نہ کر سکا۔ قسمت پر اسے اپنی قسمت کا خیال آگیا۔ اللہ نے کیسی اچھی شکل و صورت دی تھی اسے' کیسا کسرتی جسم تھا اس کا۔ یونیورسٹی میں لڑکیاں اسے پرنس چارمنگ کہتی تھیں۔ دیوانی تھیں اس کی۔ ہائے کیا دن تھے! مگر کیا زندگی ہے کہ وہ کروڑ پتی باپ کا بیٹا ہو کر ایسی مشقت کر رہا ہے--- ذلت اٹھا رہا ہے۔ بارہ بجے سے دس بجے تک ٹنٹے بن کر بھیک مانگو۔ تف ہے اس زندگی پر۔ سیکڑوں لڑکیاں سامنے سے گزر جائیں لیکن نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں اسے--- ہائے--- یہ تو ہنسنے کھیلنے کے دن تھے' فٹ پاتھ پر بھیک مانگنے کے تو نہیں اور رمضان میں تو ابا نے ڈبل ڈیوٹی کر دی ہے۔ ایک شاپنگ سینٹر کے سامنے ایک اور ٹھیا دلوا دیا ہے۔ رات دس بجے سے صبح چار بجے تک وہاں بھیک مانگو۔ تھک کر چور ہو جاؤ' گھر پہنچ کر بستر پر گر کر بے سدھ ہو جاؤ۔ نیند پوری ہونے سے پہلے اٹھو کہ ڈے شفٹ کا وقت ہو رہا ہے۔ لعنت ہے۔

اچانک تیرے کو اپنے ہاتھوں میں نوٹوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے نوٹوں کو دیکھا۔ ایک سو ایک روپے۔ واہ--- کتنا اچھا شگون ہے۔ اس نے خوش ہو کر سوچا۔ ایک سو ایک روپے تو منہ دکھائی میں ملتے ہیں۔ واہ--- لگتا ہے' قسمت کھلنے والی ہے۔ "ابے او ڈھینگ" اسی لمحے اس کے اندر سے کسی نے ڈانٹا۔ منہ دکھائی تو لڑکیوں کی ہوتی ہے' لڑکوں کو سلامی ملتی ہے--- تو چلو سلامی ہی سہی۔ اس نے سوچا' بہرحال' شگون اچھا ہے۔ الو کا پٹھا ہے تو--- اندر کی آواز نے پھر ڈانٹا--- ابے یہ کیسی سلامی ہے کہ سلامی کے ایک سو ایک میں سو تیرے اپنے ہیں اور ایک دوسرے کا' ایسی ہوتی ہے سلامی---

اور اسی لمحے دیکھتے ہی دیکھتے وہ پوری سلامی اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس نے گھبرا کر دیکھا تو ابا اسے خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "سالے--- میرے ٹھیے

پر تو دھندا نہیں کر سکتا۔" فقیرے نے بے حد خراب لہجے میں کہا۔

"ابا--- یہ میرے اپنے ہیں بھیک میں نہیں ملے۔" تیرے نے احتجاج کیا۔

"جھوٹ مت بول۔ اپنے ٹھیے پر میں بے خبر کبھی نہیں ہوتا--- خاص طور پر دھندے سے۔"

"ابا--- ایک کا نوٹ لڑکی نے دیا تھا' سو کا میرا اپنا ہے۔"

"یہ جرمانے میں ضبط ہو رہا ہے۔ ٹھیے پر بیٹھ کر یہ سب نہیں کرتے' سمجھا حرام کے تخم۔"

تیرا کہنا چاہتا تھا کہ تخم کا تو نہیں' ہاں پیٹ کا حرامی ہوں۔ وہ بھی اس لئے کہ آپ کی کمائی پر پلا بڑھا ہوں لیکن یہ کہنے میں عاق ہونے کا خطرہ تھا' جس سے بچنے کے لئے وہ بھیک تک مانگنے پر تیار ہو گیا تھا۔ "تو پھر کیا کروں ابا۔ رومانس کے لئے ٹائم ہی نہیں بچتا۔"

"رومانس کو چھوڑ کیریر کی فکر کر۔ رومانس کے لئے تو عمر پڑی ہے۔" فقیرے نے سلامی کے ایک سو ایک بغیر سلام کیے جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ "ارے افطار کا ٹائم ہو رہا ہے چل اب گھر چلیں۔"

تیرا فقیرے کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ مارکیٹ کے باہر فقیرے کی ٹویوٹا کھڑی تھی۔ وہاں پہنچ کر فقیرے نے ادھر ادھر دیکھا۔ افطار کا سائرن بجنے ہی والا تھا۔ سڑک سنسان تھی۔ اس نے جلدی سے اپنا ٹخنوں تک پہنچنے والا لبادہ اتارا۔ اس کے نیچے وہ تھری پیس سوٹ میں تھا۔ کوٹ کی جیب سے کنگھا نکال کر اس نے بال سنوارے اور چابی لگا کر کار کا دروازہ کھولا۔ اتنی دیر میں تیرا بھی ٹی شرٹ اور جینز میں برآمد ہو چکا تھا۔

فقیرے نے چند لمحے سوچا پھر چابی تیرے کی طرف بڑھائی۔ "لے--- آج تو ڈرائیو کر۔ کیا یاد کرے گا۔"

تیرے کو حیرت تو ہوئی مگر اس نے تیزی سے چابی جھپٹ لی۔ ابا کا ڈرائیونگ کا ایسا شوق تھا کہ کسی اور کو ڈرائیو کرنے ہی نہیں دیتا تھا۔

ڈرائیو کرتے ہوئے دو ہی منٹ ہوئے تھے کہ تیرے کو ابا کی عنایت کا سبب

معلوم ہو گیا۔ فقیرا اپنی گود میں دونوں اشرفیوں کو رکھے ان سے کھیل رہا تھا۔ تیرے کو پھر وہ خلش ستانے لگی جسے اس نے فٹ پاتھ پر دبا دیا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"ابا--- ایک بات کہوں' برا تو نہیں مانو گے؟"

"خالی ہاتھ کہے گا تو ضرور برا مانوں گا۔"

"ابا--- تم یہ اشرفیاں رکھنے کا خیال دل سے نکال دو۔ تمہیں ان کی ضرورت نہیں ہے تمہارے پاس سب کچھ تو ہے۔"

"میں انہیں صرف اس لئے رکھ رہا ہوں کہ یہ نادر و نایاب چیزیں ہیں۔" فقیرے نے خشک لہجے میں کہا۔

"مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ ملک و قوم کی امانت ہیں۔ ہماری نسلوں کا ورثہ ہیں۔"

"سب کہنے کی باتیں ہیں۔"

"نہیں ابا۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ ہمارے ملک میں خیر و برکت ہو۔ خوش حالی ہو۔ ان اشرفیوں کو تو جلد از جلد قومی خزانے میں پہنچ جانا چاہئے۔ ان کا راستہ کھوٹا مت کرو۔" تیرے کے لہجے میں درد مندی تھی۔ "اس نیک آدمی نے یہی کہا تھا۔"

"وہ نیک کیسے ہو گیا؟" فقیرے نے چیخ کر پوچھا۔

"سوچو ابا۔ جس نے اسے وہ اشرفیاں دیں' اس نے اس سے یہی کچھ کہا ہو گا جو اس نے تم سے کہا۔"

"ہاں تو پھر؟"

"پھر یہ کہ اس نے اپنی اشرفی بھی اپنے پاس نہیں رکھی۔ تمہیں دے دی تاکہ تمہارے دل میں بے ایمانی نہیں آئے تمہیں بھی ایسا ہی کرنا چاہئے۔"

"وہ نیک نہیں بے وقوف تھا' کنگلا تھا۔ سالے نے ایسی چیز دیکھی ہی نہیں ہو گی کبھی۔ بندر کیا جانے ادرک کا سواد مگر میں نہ بے وقوف ہوں' نہ کنگلا۔"

"تم کچھ بھی کہو ابا وہ سچا پاکستانی اور دیانت دار اور امین مسلمان تھا۔ میں کہتا ہوں' ان پر تمہارا کوئی حق نہیں۔ کیا اللہ کی امانت میں خیانت کرو گے۔"

"تو یہ کیسے کہہ سکتا ہے یہ اللہ کی امانت ہیں اور وہ کہانی سچی ہے' جو اس نے سنائی تھی۔"

"انہیں غور سے دیکھو--- دل کی آنکھوں سے دیکھو ابا۔ اللہ کا نام اور کلمہ ان کے اوپر نہیں' اندر لکھا ہے۔"

"اسی لئے تو یہ نادر و نایاب ہیں۔" فقیرے نے زور دے کر کہا۔ "اور صرف اللہ کا نام ہونے کی وجہ سے میں نے ایک لاکھ روپے قیمت دی۔ سوچ تو سہی' ہزار نہیں' پانچ ہزار نہیں' دس ہزار نہیں پورے ایک لاکھ۔ ورنہ میں اسے یونہی رکھ لیتا۔ ہے نا دیانت داری۔ ہے نا امانت داری۔"

"نہیں ابا یہ بدنیتی ہے--- خیانت ہے۔" تمہیں اشرفی آگے بڑھانے کو کہا گیا ہے' کوئی رقم نہیں۔"

"بس تو چپ کر جا۔ یہ میرا معاملہ ہے' تیرا نہیں۔ اب بولا تو---"

تیرا جانتا تھا کہ اب ابا عاق کر دینے کی دھمکی دے گا۔ چپ رہنے میں ہی عافیت تھی۔

سامنے فٹ پاتھ پر کھڑے ایک جوان فقیر نے گاڑی روکنے کے لئے ہاتھ دیا۔ تیرے کو دیکھنے میں دیر ہو گئی۔ گاڑی آگے نکل گئی۔ اس نے جلدی سے بریک لگائے اور گاڑی ریورس کرنے لگا۔

"ابے یہ کیا کر رہا ہے؟" فقیرا چلایا۔

"ابا--- نظیر بھائی کو لینا ہے۔"

فقیر پچھلا دروازہ کھول کر فقیرے کے برابر بیٹھ گیا۔ فقیرے نے تیرے سے پوچھا۔ "کہاں ہے جیرا؟"

"میں یہاں ہوں ابا!" برابر بیٹھے ہوئے نظیر نے کہا۔

"کمال ہے میں پہچانا ہی نہیں۔" فقیرے نے کھسیا کر کہا۔

"ہمیں تو ہمارے ماں باپ بھی نہیں پہچانتے ابا۔" جیرے نے دردناک لہجے میں کہا۔ "پرسوں اماں میرے ٹھئے کے سامنے سے گزری۔ میں نے سلام کیا تو اجنبیت سے مجھے دیکھا اور میرے سامنے چونی پھینک کے آگے بڑھ گئی۔ پہچانا ہی نہیں مجھے۔"

"پہچان کر ہی چونی دی ہو گی۔ یہ سوچ کر کہ گھر کا مال گھر میں ہی رہے گا۔" فقیرے نے اسے دلاسا دیا۔ "ورنہ وہ تو اپنی دائیں بھی کسی کو نہیں دیتی۔"

"یہ کیا ابا؟" جیرے نے فقیرے کی گود میں رکھی اشرفیوں کو دیکھا۔

تیرے نے اسے پوری تفصیل مع اس معاملے میں اپنی رائے کے سنا ڈالی۔ جیرے کا بھی یہی کہنا تھا کہ ان اشرفیوں کو آگے بڑھا دینا چاہئے۔ فقیرے نے اسے بھی عاق کرنے کی دھمکی دے کر خاموش کرا دیا۔

کچھ اور آگے جا کر انہوں نے شیدے کو پک کیا۔ وہ فقیرے کے بیٹوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس نے اپنی بیساکھیاں اگلی سیٹ پر رکھیں اور خود پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر بغلیں سہلانے لگا۔ "میرا گیٹ اپ بدلو ابا۔ بغل میں سوجن بڑھتے بڑھتے گٹھلیاں بن گئی ہیں۔ لعنت ہو ان بیساکھیوں پر۔" اس نے شکایت کی۔

"تو ایک جگہ بیٹھا رہا کر لنگڑے زیادہ چلا نہیں کرتے۔" فقیرے نے مشورہ دیا۔

"بیٹھے بیٹھے ٹانگیں اکڑ جاتی ہیں۔ لگتا ہے' سچ مچ لنگڑا ہو جاؤں گا۔"

"تو کوئی بات نہیں' بیساکھیاں تو موجود ہیں نا۔"

شیدے کو بھی وہ اشرفیاں دیکھ کر تجسس ہوا۔ اسے بھی وہ کہانی سنائی گئی۔ وہ بھی دونوں بھائیوں سے متفق تھا بلکہ اس کے مطالبے میں شدت تھی۔ اسے بھی وہی دھمکی ملی اور وہ بھی چپ ہو گیا۔

گھر پہنچ کر انہوں نے کھانا کھایا۔ "آج نائٹ شفٹ گیارہ بجے ہو گی۔" فقیرے نے اعلان کیا۔ "گیارہ بجے سے پہلے بازار میں گرمی نہیں آتی۔"

اس پر تینوں لڑکوں نے سکون کا سانس لیا۔ کھانے کے بعد وہ آرام کرنے کے لئے اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ فقیرا اپنے کمرے میں جا کر اشرفیوں سے کھیلنے لگا۔ ان سے ایک لمحے کے لئے جدا ہونا بھی اسے گوارا نہیں تھا۔

ساڑھے دس بجے اس نے بیٹوں کو تیار ہونے کی ہدایت کی۔ پونے گیارہ بجے وہ باتھ روم میں گیا۔ باہر آیا تو اشرفیاں غائب تھیں' جنہیں وہ بیڈ پر چھوڑ کر گیا تھا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا یعنی کوئی اندر آ نہیں سکتا تھا اور اندر وہ اکیلا ہی تھا۔

وہ پاگلوں کی طرح اشرفیوں کو تلاش کرتا رہا لیکن وہ ہوتیں تو ملتیں۔ وہ باہر نکل آیا اور چیخ و پکار کرنے لگا۔ لڑکے اس کے خاص ہدف تھے۔ "تم تینوں میری مخالفت

کر رہے تھے۔ وہ اشرفیاں تمہی نے چرائی ہیں۔" اس نے دہاڑ کر کہا۔

"لیکن ابا' ہم تو اپنے کمرے سے نکلے ہی نہیں۔" شیدا بولا۔

"میں کچھ نہیں جانتا۔ پانچ منٹ میں اشرفیاں مجھے دے دو۔ ورنہ میرے گھر سے نکل جاؤ۔ میں تمہیں عاق کر دوں گا۔"

لڑکوں نے معقولیت سے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اس کے بند کمرے میں تو کسی بھی طرح نہیں گھس سکتے تھے لیکن ان اشرفیوں کی گمشدگی نے فقیرے کو پاگل کر دیا تھا اور لڑکے اشرفیاں کسی بھی طرح نہیں دے سکتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فقیرے نے بیوی کے سمجھانے کے باوجود تینوں کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ "آج کے بعد مجھے اپنی صورت نہ دکھانا۔ میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں۔" اس نے گرج کر کہا پھر اس نے گیٹ بند کر لیا اور اتنا اپ سیٹ تھا کہ اس روز وہ نائٹ شفٹ پر بھی نہیں گیا۔

باہر تینوں لڑکے ہکا بکا کھڑے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ "اب کیا ہو گا بھائی!" تیرے نے فریاد کی۔

اس پر شیدا تن کر کھڑا ہو گیا۔ "اچھا ہی ہو گا انشاء اللہ۔" اس نے کہا۔ "اچھا ہی ہوا اس ذلت کی زندگی سے نجات مل گئی۔ ہم پڑھے لکھے ہیں' ذہین ہیں۔ عزت کا کام کریں گے۔ عزت سے رہیں گے۔"

شیدے نے چند لمحے سوچا پھر بولا۔ "ابھی تو کسی ہوٹل میں کمرا لیں گے اور کل سے بیک وقت نوکری اور کرائے کے مکان کی تلاش شروع۔"

"لیکن پیسے---"

"بیس بائیس ہزار تو میرے پاس ہیں۔" شیدے نے کہا۔

اتنے ہی میرے پاس بھی ہوں گے۔" جیرا بولا۔

"پندرہ کے قریب میرے پاس ہیں۔"

"بس تو پھر کیا ہے۔" شیدے نے اعتماد سے کہا "ملک خدا تنگ نیست۔ پائے مرالنگ---"

"است بھائی' لنگ است" تیرے نے جلدی سے اس کا جملہ پورا کر دیا۔

"نہیں تیرے' پاؤں مرالنگ نیست۔ بیساکھیوں میں اس منحوس بنگلے ہی میں چھوڑ آیا ہوں۔"

وہ تینوں ٹیکسی کی تلاش میں آگے بڑھ گئے۔ ان کے قدم پہلی بار خود اعتمادی سے اٹھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نئی' باعزت زندگی کے خواب تھے۔

میں نے قلم بند کر کے رکھا اور جو کچھ لکھا تھا' اسے پڑھا۔ اچانک میری کیفیت بہت عجیب ہو گئی۔ مجھے وہ سب کچھ افسانہ لگنے لگا--- حقیقت سے دور۔ وہ مسجد' وہ رات' بابا عصر اور حارث بن عثمان--- پتہ نہیں وہ خواب تھا یا فینٹاسی۔ لیکن نہیں' خواب تو وہ نہیں ہو سکتا تھا اور فینٹاسی بھی نہیں۔ میرے اندر کسی نے چپکے سے کہا۔ فینٹاسی کسی ایک ذہن کی پیداوار ہوتی ہے۔ وہ انفرادی ہوتی ہے' اجتماعی نہیں۔ کوئی اس میں دوسروں کو شریک نہیں کر سکتا کیونکہ اپنے تخیل کے بارے میں دوسروں کو بتایا تو جا سکتا ہے لیکن اپنا تخیل دوسروں کو دکھانا ممکن نہیں۔ جبکہ یہاں دوسرے بھی اس میں شامل ہیں' میرے اپنے بیوی بچے!

اور یہ سچ تھا۔ حارث بن عثمان میرے گھر آئے تھے۔ میرے بیوی بچے ان سے ملے تھے۔ میرے بچوں نے دیکھتے ہی انہیں ماموں کہنا شروع کر دیا تھا۔ ناہید انہیں بھائی جان کہنے لگی تھی' بلکہ انہوں نے رات ہمارے ہاں گزاری تھی۔ ہمارے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر سحری کی تھی اور پھر افطار بھی۔ وہ میرا تخیل نہیں تھے۔ اگر وہ فینٹاسی تھی تو اجتماعی تھی۔

میں چونکا۔ مجھے خیال آیا کہ حارث تو اس وقت بھی میرے گھر میں ہیں۔ وہ دوسرے بیڈ روم میں سو رہے ہوں گے۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ سوا گیارہ بجے تھے۔ میری کیفیت عجیب تھی۔ اتنی دلیلوں کے باوجود مجھے وہ سب کچھ حقیقت نہیں لگ رہا تھا۔ میں اٹھا اور دوسرے بیڈ روم کی طرف چل دیا۔ میں اس وقت یقین اور گمان کے درمیان معلق تھا۔ حارث اس کمرے میں سو رہے ہوں گے--- حارث اس کمرے میں نہیں ہوں گے۔ میں ان دو بیانوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔

میں نے بڑی آہستگی سے بیڈ روم کا دروازہ کھولا کہ کہیں حارث کی نیند نہ اچٹ

جائے۔ اس احتیاط پر مجھے خود ہنسی آگئی۔ گمان نے بڑبڑا کر کہا ---- بے وقوف' جو شخص موجود نہیں ہے' اس کی نیند کیسے اچٹے گی۔

دروازہ کھلا۔ حارث بن عثمان نہ صرف کمرے میں موجود تھے بلکہ وہ جاگ بھی رہے تھے۔ ان کی انگلیاں ہاتھ میں موجود تسبیح کے دانوں پر گردش کر رہی تھیں۔ انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میں دروازہ بند کرنے لگا تو وہ جلدی سے بولے "آؤ نا آفاق میاں!"

"میں آپ کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ آؤ میاں' کچھ دیر میرے پاس بیٹھو۔" میں اندر جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ "سوئے نہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"میں تو بہت دیر سے سوتا ہوں' لکھ رہا تھا کہ آپ کا خیال آگیا۔"

"جو لکھ رہے تھے' اس پر یقین نہیں آرہا ہوگا۔ اس لئے یہاں چلے آئے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں' یہی بات ہے۔"

"بابا عصر نے جو بتایا تھا' لکھ لیا؟"

"جی ہاں۔"

"تو پھر یقین کچھ دشوار نہیں۔ اپنی جیب دیکھو' اشرفیاں واپس آگئی ہوں گی۔"

مجھے حیرت ہوئی کہ مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر چھوئے بغیر ہی مجھے احساس ہوگیا کہ اشرفیاں واپس آچکی تھیں۔ میری جیب بھاری ہو رہی تھی۔ میں مضطربانہ اٹھ کھڑا ہوا۔ حارث جلدی سے بولے "بیٹھو نا۔"

"پھر آؤں گا۔ آپ کے پاس۔ ابھی تو مجھے کچھ لکھنا ہے۔ ذہن سے نہ نکل جائے۔"

"تب تو ضرور جاؤ۔ لیکن آتے ہوئے بالکل نہ ہچکچانا۔ میں بہت دیر سے سوتا ہوں۔"

میں کمرے سے نکلا اور اسٹڈی میں آگیا۔ اپنی کرسی پر بیٹھ کر میں سوچتا رہا۔

مجھے لکھنا تھا۔ لکھنا تھا کہ ان اشرفیوں کے آتے ہی میں نے خیر و برکت اور اللہ کی تائید دیکھی اور یہ خیر و برکت اور تائید تو اس بدنصیب فقیرے کو بھی نصیب ہوئی' جس کی نیت خراب تھی' جو امانت دار نہیں تھا۔ اس سے بڑھ کر خیر و برکت کیا ہوگی کہ اس کے تین پڑھے لکھے ہونہار جوان بیٹے جنہیں اس نے دولت کی چکاچوند دکھا کر غلط راستے پر ڈال دیا تھا' اس کے سحر سے آزاد ہوچکے تھے۔ وہ اس کی حرام کی دولت چھوڑ کر خود انحصاری کے راستے پر چل پڑے تھے۔ اس عزم کے ساتھ کہ اپنی دنیا آپ بنائیں گے۔ یہ جذبہ' تعمیر یہ خودداری بھی تو خیر ہے۔

مجھے ان تینوں ان دیکھے لڑکوں پر پیار آنے لگا۔ میں نے صرف تیرے کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ اشرفیاں میں فقیرے کو دے رہا تھا۔ مگر اس وقت وہ ننگے بھکاری کے گیٹ اپ میں تھا۔ نہ جانے عام لباس میں وہ کیسا لگ رہا ہوگا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں نے تو انہیں دیکھا تھا۔ اشرفی کا سفرنامہ لکھتے وقت اور وہ بہت اچھے لگ رہے تھے۔



میں نے قلم کھولا اور لکھنا شروع کر دیا۔

اگلی صبح ناشتہ کرتے ہی میں گھر سے نکل آیا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اشرفیاں کسی امانت دار تک پہنچائے بغیر میں کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔ یہ سوچ کر بھی مجھ پر ہول چڑھ رہا تھا کہ ایک دن تو ضائع ہو ہی چکا ہے۔ اگر یہ اشرفیاں کئی دنوں میں ایک قدم آگے بڑھیں گی تو یہ سفر تو خدانخواستہ دس سال سے بھی زیادہ جاری رہے گا۔ یہ تو بہت بری بات ہوگی۔ میرا بس چلتا تو ایک ہی دن میں یہ سفر پورا کر دیتا۔

یہ بات میرے لئے بوجھ بن گئی۔ جس طرح میں اس روز چل رہا تھا' وہ میرا اسٹائل نہیں تھا۔ میرے قدم بہت آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔ میں ادھر ادھر دیکھتا' ہر طرف کان لگائے چل رہا تھا۔ میرے گھورنے کے احساس پر کئی عورتوں نے مجھے سخت نظروں سے دیکھا۔ لیکن میں اس وقت اپنی ہی دھن میں تھا۔

مجھے بے شمار ایسے افراد ملے جنہیں میں وہ اشرفیاں سونپ سکتا تھا لیکن ذرا سا

مشاہدہ کرنے پر مجھے کچھ ایسی باتیں نظر آئیں کہ میری ان پر اعتبار کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ اشرفی کسی کو بھی تھما سکتا ہوں' وہ غلط ہاتھ ہوئے تو اشرفی واپس آجائے گی لیکن یہ مجھے گوارا نہیں تھا۔ گزشتہ رات اشرفیوں کی واپسی سے مجھے جو اذیت ہوئی تھی وہ میں دوبارہ اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ مایوسی اور ناامیدی سے میں بچنا چاہتا تھا۔ میں اس پر یقین رکھنا چاہتا تھا کہ معاشرے میں اہل ایمان ابھی موجود ہیں اور انہی کی وجہ سے ہم اللہ کے غضب سے بچے ہوئے ہیں۔ پھر اشرفیاں واپس آنے میں وقت بھی ضائع ہوتا تھا۔ جبکہ اس کام کو تیزی کی ضرورت تھی۔

چلتے چلتے دوپہر ہوگئی۔ میری ٹانگیں دکھنے لگیں۔ میں بیٹھ کر لکھنے والا آدمی ہوں۔ چلنے کا موقع ہی کم ملتا ہے اس لئے عادت بھی نہیں رہی ہے۔ تھکن کے ساتھ مجھے مایوسی بھی ہونے لگی کہ اتنے انسانوں کی بھیڑ میں میرا کسی پر دل نہیں ٹھکتا۔ مگر میں نے اس مایوسی کو ذہن سے جھٹک دیا۔ یہ میرا عزم تھا اور اللہ سے دعا تھی کہ اشرفیاں اس بار اہل ہاتھوں کو ہی سونپوں گا۔

پھر اچانک میری آنکھیں چمکنے لگیں۔ مجھے گوہر مقصود نظر آگیا۔ سامنے سے پاک وطن کا ایک فوجی مجھے آتا نظر آیا تھا۔

فوجی وردی بچپن ہی سے میری کمزوری ہے۔ جب میں بچہ تھا اور کسی بھی فوجی کو دیکھتا تھا تو میرا ننھا سا دل محبت اور خوشی سے لبالب ہو کر چھلکنے لگتا تھا۔ میری آنکھیں بھیگنے لگتی تھیں۔ مجھے عالم اسلام کے بڑے بڑے جرنیلوں' مجاہدوں' غازیوں اور شہیدوں کا خیال آجاتا تھا۔ میرے والد میری اس کیفیت کو سمجھتے تھے۔ وہ ساتھ ہوتے ایسے میں تو کہتے --- اس فوجی جوان کو سلوٹ کیوں نہیں کرتے؟ مگر میں شرمیلا بہت تھا۔ مجھے سلوٹ کرنا آتا تھا لیکن میں کہہ دیتا کہ مجھے آتا ہی نہیں۔ مگر میرے اندر فوجی وردی پہنے ایک چھوٹا سا بچہ کھٹ سے دونوں ایڑیاں ملا کر بہت زبردست سلوٹ کرتا تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ سلوٹ میرے سوا کبھی کسی کو نظر نہیں آیا۔

اور فوجی وردی میرے لئے بس فوجی وردی ہے۔ مجھے اب بھی رینک کی سمجھ بوجھ نہیں۔ سچ یہ ہے کہ میں نے کبھی رینک کو سمجھنا ہی نہیں چاہا۔ مجھے اس سے

غرض نہیں' رینک کوئی بھی ہو' فوج کے ہر جوان سے مجھے عقیدت ہے۔ سپاہی سے لے کر جنرل تک سب میرے لئے یکساں طور پر لائق احترام اور بے حد محبوب ہیں کیونکہ اپنے اپنے مقام پر' اپنے اپنے انداز میں سب ہمارے وطن کی حفاظت کے لئے سرکف ہوتے ہیں۔

میں وہیں کھڑا ہوگیا تھا۔ فوجی جوان میرے قریب سے گزرنے لگا تو میں نے آہستہ سے کہا "سنئے صاحب' آپ مجھے چند منٹ دے سکتے ہیں؟"

فوجی جوان نے شک و شبے کی نظر سے مجھے دیکھا "کیا بات ہے؟" اس نے کرخت لہجے میں کہا۔

"آپ سے ایک کام ہے" میں نے کہا پھر اس کی پیشانی پر شکنیں پڑتے دیکھ کر جلدی سے وضاحت کی "کام میرا ذاتی نہیں' پاکستان کے لئے اور دین اسلام کے لئے ہے۔"

یہ سنتے ہی فوج جوان کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ وہ سراپا سپردگی بن گیا۔ چہرے پر نرمی بکھر گئی "پاکستان اور اسلام کے لئے تو میری جان بھی حاضر ہے" اس نے والہانہ انداز میں کہا "شہادت میری مطلوبہ منزل ہے" اتنا کہنے کے بعد اس کی آنکھوں میں شک کی پرچھائیاں لہرانے لگیں "لیکن تم ایسے کون ہو کہ مجھ سے اس طرح کا کوئی کام لینا چاہتے ہو؟"

میں نے جلدی سے اشرفیاں نکالیں اور ہتھیلی اس کے سامنے پھیلا دی۔ وہ مبہوت ہو کر رہ گیا۔ میں اسے سب کچھ بتاتا رہا۔ یہ بھی بتا دیا کہ اشرفی واپس آنے میں وقت کا زیاں ہے۔ یہ کام جتنی جلدی مکمل ہو جائے' اتنا ہی اچھا ہے۔

وہ ایک دم تم سے آپ پر آگیا "آپ فکر نہ کریں۔ میں انشاء اللہ اپنا کام جلد سے جلد نمٹا لوں گا۔ ویسے بھی آج میرا آف ہے۔ میں پورے دن بھی پھر سکتا ہوں۔"

"شکریہ۔"

"شکریہ کیسا۔ یہ تو میرا ذاتی کام ہے۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا' سلام کیا اور اپنے گھر آگیا۔



اس شام چاند نظر نہیں آیا۔ روزے داروں کو پورے تیس روزے رکھنے کی سعادت اور خوشی نصیب ہوئی۔

حسب معمول عشاء کے بعد میں اور حارث بن عثمان چہل قدمی کر رہے تھے کہ بابا عصر ہم سے آملے "ہاں بھئی' تو کیا بات ہو رہی تھی؟"

مجھے حیرت ہوئی کہ مجھے یاد تھا' سلسلہ گفتگو کہاں سے ٹوٹا تھا۔ "ہم ہندوؤں کی پہلی ناکامی کی بات کر رہے تھے" میں نے کہا "ان کا خیال تھا کہ جدوجہد کرتے ہوئے پاکستان کو آسانی سے نگلا جاسکتا ہے لیکن یہ خیال خام ثابت ہوا۔"

"بالکل ٹھیک۔" بابا عصر نے کہا "اصل میں انہیں اس جذبے کا علم نہیں تھا جو اللہ تعالی نے ان بے سروسامانوں کو عطا فرمایا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ان دنوں دفتروں میں کام ہوتے دیکھا ہے۔ کرسی نہیں ہے تو فرش پر بیٹھ گئے۔ کاغذ اور پنسل تک کی قلت تھی۔ بس ایک جذبہ تعمیر تھا جو مایوسی سے بچا کر کام کی لگن دیتا تھا۔ ہر جگہ یہی حال تھا اور لوگوں کے چہرے تمتمائے ہوئے رہتے تھے" انہوں نے آہ بھری "اب وہ لوگ کہاں' اب وہ جذبہ کہاں؟ خیر--- یہ تو اللہ کی دین ہے۔ جب چاہے' دے دے۔ تو یوں سمجھ لو کہ ان دنوں پاکستان میں ہر جگہ' چپے چپے پر' گھروں میں' دفتروں میں' فیکٹریوں میں' کھیتوں میں' سڑکوں اور کچے راستوں پر--- غرض ہر جگہ پاکستان کی بقا کی جنگ لڑی جا رہی تھی۔ ہر شخص مجاہد تھا۔ ہر دل کی ایک ہی آواز تھی --- زندہ تو غازی مرے تو شہید۔ ایسی قوم کو کوئی شکست دے سکتا ہے؟"

"آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اس دور میں کوئی برا تھا ہی نہیں؟" میں نے اعتراض کیا۔

"نہیں۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ بدی نہ ہو تو نیکی کی پہچان کیسے ہو۔ اس وقت بھی بے ایمان لوگ موجود تھے اور وہ اپنے مفاد کے لئے کام کر رہے تھے۔ انہیں ملک کی بقا کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ ہندوستان میں زمینیں' جاگیریں چھوڑ کر آنے والے ملک کی تعمیر میں مزدور کی طرح مصروف تھے۔ وہ سب کچھ کرنے کے لئے تیار تھے۔ وہ کچھ

نہیں مانگتے تھے۔ ان کا کوئی دعوی نہیں تھا جبکہ بے ایمان لوگ جعلی کلیم بھر کر ان مجاہدوں کے حصے کی زمینیں' مکانات' حویلیاں اور جاگیریں حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ یہی تو ہوا۔" بابا عصر نے پھر آہ بھری۔ "لوگ شکایت کرتے ہیں کہ پاکستان میں بڑے چھوٹے اور چھوٹے بڑے ہوگئے۔ عظمت حقیر ہوگئی اور پستی بلندی پر چڑھ بیٹھی۔ لیکن یہ سچ نہیں' اس لئے کہ یہ دنیاوی نقطہ نظر ہے۔ اللہ کی نظر سے دیکھو تو بڑے اور بڑے ہوگئے۔ چھوٹے اور چھوٹے ہوگئے۔ عظمت کو اور عظمتیں ملیں۔ پستی اور پستی میں چلی گئی۔ یہ معاشرے میں بڑھتی ہوئی مادہ پرستی کا قصور ہے کہ بلندی کو پستی اور پستی کو بلندی سمجھا جانے لگا لیکن اب بھی جو لوگ ایثار و قربانی کا مفہوم اور اس کا اجر سمجھتے ہیں' وہ کبھی محرومی کی شکایت نہیں کرتے کہ آخرت کا اجر سب سے بڑا اجر ہے۔ خیر--- تم اپنی بات جاری رکھو۔"

"ہندوؤں کا زعم اتنا بڑا تھا کہ اس جھٹکے سے دور نہیں ہوسکا۔ پھر حیدر آباد دکن کو ہڑپ کر لینے کے بعد ان کا اعتماد اور بڑھ گیا۔ اب ان کے عزائم اور بڑے تھے۔ اس کے تحت ۶ ستمبر ۶۵ء کو انہوں نے بغیر اعلان کئے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ ان کا دعوی تھا کہ چند گھنٹے بعد وہ لاہور جم خانہ میں جشن فتح منائیں گے اور جام فتح تجویز کریں گے۔"

اللہ نے وعدہ فرمایا کہ جب تک کفر سے لڑو گے تو ہم تین ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کریں گے اور اگر تم پر اچانک' خبردار کئے بغیر کفر حملہ کرے گا تو پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کی جائے گی" بابا عصر نے کہا "اور کراچی میں ان گنت عینی شاہد موجود ہیں جنہوں نے ایک سبزپوش بزرگ کو دیکھا کہ بھارتی طیاروں سے گرائے جانیوالے بم اپنے ہاتھوں میں لے کر سمندر میں اچھال دیتے ہیں۔"

"خود بھارتی فوجیوں نے بھی ایسے بے شمار واقعات بیان کئے اور تقریباً" ہر محاذ پر یہی کچھ ہوا" میں نے کہا۔

"شہدا کبھی نہیں مرتے۔ وہ زندہ رہتے ہیں۔ وہ پاکستان کی باطنی' نظر نہ آنے والی فوج ہیں۔ بس یہ یاد رکھو کہ وہ ایمان والوں کے حلیف ہیں۔"

"جی ہاں۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ بھارت کو منہ کی کھانی پڑی۔ لاہور کی پاک زمین کو

تو وہ چھو بھی نہیں سکے۔ الٹا اپنی زمین گنوا بیٹھے۔ چونڈہ کا میدان بھارتی ٹینکوں کا قبرستان بن گیا۔"

"جانتے بھی ہو کیسے؟" بابا عصر نے گرج کر کہا پھر خود ہی بولے۔ "قوم کا ہر فرد جذبہ' جہاد' جذبہ ایمان سے سرشار تھا۔ ایسی یکجہتی پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی' نہتے شہری ڈنڈے لے لے کر سرحد پر پہنچ گئے تھے۔ ٹینکوں کی یلغار دیکھ کر ان جیالوں نے حساب لگایا کہ ہر فوجی کی زندگی بہت قیمتی ہے --- ایک عام آدمی سے سوگنا' ہزار گنا زیادہ قیمتی۔ کیونکہ وہ دفاع پاکستان کی فصیل کی اینٹ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جہاں تک ممکن ہو' اسے بچایا جائے۔ چنانچہ عام شہری جسم سے بم باندھ کر یلغار کرنے والے ٹینکوں کی پہلی صف میں گھس گئے اور اسے تباہ کر دیا۔ ان ٹینکوں نے پچھلے ٹینکوں کی یلغار روک دی۔ پھر انہیں ناکارہ بنانا مشکل نہیں رہا۔"

"جی ہاں۔ یہ بات میں نے بھی سنی ہے" میں نے کہا۔ مجھے کچھ خیال آیا تو میں نے پوچھا "ایک بات تو بتائیں' عربوں نے بھی دو جنگیں لڑیں اور وہ تعداد میں یہودیوں سے زیادہ تھے مگر انہیں شکست ہوئی۔ وہ بیت المقدس بھی کھو بیٹھے ----- اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی تائید انہیں حاصل نہیں تھی' کیوں؟"

"اللہ کی باتیں اللہ جانے۔ لیکن اس کے بندے اس کے احکام کی روشنی میں انہیں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں" بابا عصر نے کہا "میرا خیال ہے کہ عربوں نے کوئی جنگ اللہ کے لئے نہیں لڑی۔ اسلام کے لئے نہیں لڑی۔ لڑتے وقت صرف اللہ پر تکیہ نہیں کیا۔ دوسری طرف اس سے پاکستان کی اہمیت بھی ثابت ہوجاتی ہے' جو تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"لیکن ۷۱ء کی جنگ میں کیا ہوا؟"

"وہی عربوں والا حشر" بابا عصر کے لہجے میں تلخی آگئی "۶۵ء میں بھارت نے سمجھ لیا کہ میدان جنگ میں پاکستان کو شکست نہیں دی جاسکتی۔ انہوں نے حکمت عملی تبدیل کرلی۔ انہوں نے سازشیں کیں۔ پاکستانیوں کے اتفاق کو پارہ پارہ کرنے کے سلسلے میں کام کیا۔ زہریلا پروپیگنڈا کیا۔ نفرت اور تعصب کو ابھارا' جو پہلے ہی موجود تھا۔ غلطیاں تمہاری بھی تھیں۔ بھائیوں کو بھائیوں سے محرومیوں کا گلہ تھا لیکن بااختیار

بھائیوں نے اس کی پروا نہیں کی۔ نہیں سمجھا کہ محرومیوں کا ازالہ نہیں کروگے تو دشمن انہیں ایکسپلائٹ کرکے ان کی صفوں میں انتشار پیدا کرے گا۔ پھر اس وقت قیادت بھی بدکاروں اور بے راہ رووں کے ہاتھوں پر تھی اور اللہ پر تکیہ کرنا تو کجا' اللہ سے مدد بھی نہیں مانگی گئی۔ تم تو امریکا اور چین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ساتویں بحری بیڑے سے آس لگائے بیٹھے تھے۔"

میں نے شرمندگی سے سر جھکا لیا "جی --- یہ سچ ہے۔"

"پھر بھی پاکستان پر ہمیشہ اللہ کا ہاتھ رہا" بابا عصر بولے "ایک کمیونسٹ نے پاکستان میں ایک ہفتہ گزارا تو اللہ پر ایمان لے آیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس ملک کا ہر ہر فرد' وہ صاحب اختیار و اقتدار ہو یا عام آدمی ہو' اپنے اپنے طور پر ملک کی جڑیں کاٹ رہا ہے پھر بھی یہ ملک قائم و دائم ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کوئی سپریم طاقت موجود ہے' جو اس کی حفاظت کر رہی ہے۔ جسے اس کا ختم ہونا منظور نہیں۔ تو یہ طے ہے کہ پاکستان پر اللہ کی نظر کرم ہے۔"

"لیکن کیوں؟"

"اس کی مرضی۔ اس کے ہر کام میں سو حکمتیں ہوتی ہیں۔ وہ بندے کی عقل کو روشنی عطا کرے تو بندہ سمجھ لیتا ہے۔"

"دیکھیں بابا' مسلمانوں نے اسپین کو فتح کرنے کے بعد سات سو سال وہاں حکومت کی۔ مگر اب وہاں ان کا نام و نشان بھی نہیں۔ یادگاریں بھی مٹ گئی ہیں اور مٹتی جا رہی ہیں۔"

"لیکن اس سرزمین --- یعنی برصغیر میں انشاء اللہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ بلکہ اسلام کی آخری فتح میں یہ خطہ انشاء اللہ بہت اہم رول ادا کرے گا۔"

"کیوں؟"

"اسپین کی فتح کرکے اسلامی سلطنت میں توسیع کی گئی لیکن تبلیغ نہیں ہوئی۔ وقت گزرا تو مسلمان لہو و لعب میں پڑگئے۔ نصرانیوں کے شوق اور مشغلے اپنا لئے گئے۔ پھر سازشیں ہوئیں' مسلمانوں نے غداریاں کیں' اس کا نتیجہ تو یہی نکلنا تھا۔"

"لیکن ہندوستان میں بھی یہی سب کچھ ہوا۔" میں نے اعتراض کیا۔

"ایک فرق تھا۔ یہاں تبلیغ ہوئی۔ اسلام ہمیشہ اخلاق سے پھیلا ہے۔ تلوار سے نہیں۔ محمد بن قاسم کو یہاں بہت تھوڑی مہلت ملی لیکن اتنے کم وقت میں بھی اس نے اپنے حسن سلوک سے دل جیت لئے۔ اسلامی اخوت نے ہندوستان کے مظلوم معاشرے کی مظلوم اکثریت کو پہلی بار احساس تحفظ دیا۔ وہ جو کچھ نہیں تھے' انہیں احساس دلایا کہ وہ بھی کچھ بن سکتے ہیں۔ چنانچہ لوگ تیزی سے مسلمان ہونے لگے اور وہ خوف سے نہیں' رغبت سے مسلمان ہوئے تھے۔ ان پر اپنی تاریکی بھی کھل گئی تھی اور اسلام کی روشنی بھی۔ پھر وہ اندھیرے میں کیسے رہتے۔

اب ایک اور اہم بات سنو۔ شاید تم نے اس پر غور نہیں کیا ہوگا۔" بابا عصر نے کہا "ہر عہد میں اللہ کی طرف سے انسانوں کے لئے ہدایت آتی رہی۔ اللہ پیغمبروں کو بھیجتا رہا۔ یہاں تک کہ حضور کی بعثت کے ساتھ ہی نبوت کا سلسلہ مکمل ہوگیا' دین مکمل ہوگیا۔ شریعت مکمل ہوگئی۔ غور کرو تو بیشتر انبیائے کرام' ایک خاص خطے میں اتارے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عرب میں تشریف لائے۔ آپ رحمتہ اللعالمین تھے۔ چنانچہ اسلام کی روشنی پوری دنیا میں پھیل گئی۔ اب اس خطے برصغیر کے بارے میں سوچو۔ محمد بن قاسم کے ساتھ یہاں مسلمانوں کی آمد شروع ہوئی۔ محمد بن قاسم کے ساتھ آنے والے بہت سے مسلمان یہیں رہ گئے۔ ان کے کردار اور اخلاق سے متاثر ہوکر ہندو مسلمان ہوتے رہے۔ مگر اللہ نے اس خطے کو اور طرح سے نوازا۔ ختم نبوت کے بعد ولایت کا سلسلہ شروع ہوا اور تاریخ اٹھا کر دیکھ لو' تمام ولی کامل یہیں گزرے۔ وہ اس خطے میں دور دراز کا سفر کرکے آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ انہوں نے محبت اور سلوک سے دل جیتے اور اسلام کو پھیلانے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ وہ سب آئے نہیں' بھیجے گئے تھے اور اسی لئے بھیجے گئے تھے۔ اللہ کے حکم اور اس کی مرضی سے آئے تھے۔ ہر ایک کا اپنا اپنا مرتبہ اور مقام تھا۔ اپنے اپنے علاقے تھے۔ وہ اس برصغیر کی باطنی حکومت تھی۔ جیسے بادشاہ اپنی مملکت کے مختلف حصوں میں گورنر مقرر کرتے ہیں' ویسے ہی یہ اپنے اپنے علاقے میں مقتدر اعلیٰ کے گورنر تھے۔ وہ بغیر فوج کی طاقت کے حکومت کرتے تھے۔ دلوں پر۔ وہ لوگوں کو جینا سکھاتے تھے۔ ان کے مزاروں سے آج بھی لاکھوں کروڑوں کو فیض ملتا ہے۔ ہندوستان سے لے کر کشمیر کے

دور دراز کے گاؤں دیہاتوں تک یہ روحانی مملکت قائم تھی --- اور آج بھی قائم ہے۔

اب تم اسپین اور ہندوستان کا فرق سمجھو گے۔ یہاں بھی بادشاہوں نے حکومت کی لیکن یہاں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق ولیوں نے اسلام کو عام آدمی تک پہنچا دیا۔ اس کی وجہ سے یہاں اسلام درباروں اور اقتدار کے ایوانوں تک محدود نہیں رہا۔ یہاں نسلوں کی تقدیر بدل گئی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ عرب کے بعد اسلام سے سب سے زیادہ فائدہ اس خطے کو پہنچا اس لئے کہ یہاں اسلام کو قائم رہنا تھا۔ اس لئے کہ اس خطے کے مسلمانوں کو اسلام کی سربلندی میں فعال کردار ادا کرنا تھا۔ حق و باطل کے معرکے میں انہیں اسلام کا ہراول دستہ ہونا تھا۔ اسی لئے یہاں مسلمانوں کو کبھی ہندوؤں کا زیر دست نہیں ہونے دیا گیا۔ ہندوؤں نے مسلمانوں پر کبھی حکومت نہیں کی اور جب وہ وقت آیا کہ ہندو صدیوں کی غلامی کا حساب لینے کو تیار ہوئے تو پاکستان بن گیا۔ سرزمین ہند پر ایک اسلامی مملکت --- اللہ کی قائم کی ہوئی ایسی مملکت کہ جسے اپنے پرائے سرتوڑ کوشش کے باوجود ختم نہیں کرسکے اور کبھی ختم نہیں کرسکیں گے۔ یہ ہے پاکستان کی اہمیت' سمجھ میں آتی ہے؟"

میں حیرت سے سوچ رہا تھا۔ واقعی یہ تو ہے۔ اللہ نے دین کی تبلیغ کا کام اس خطے میں اپنے نیک اور برگزیدہ بندوں سے لیا۔ انہیں کہاں کہاں سے بھیجا۔ بات تو بالکل واضح تھی۔ "جی --- میں سمجھ گیا لیکن یہ عنایت اسپین پر کیوں نہیں ہوئی؟"

"حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے۔ لیکن بندہ اس کا ہو اور کوشش کرے تو سمجھ سکتا ہے۔ اللہ کو وہ لوگ بہت ناپسند ہیں جن تک ہدایت پہنچی' جن پر اس نے عنایات کیں' جنہیں روشن نشانیاں دکھا دی گئیں' جن کے لئے معجزے بھی رونما ہوئے۔ مگر وہ ہدایت پانے کے بعد گمراہی میں پڑ گئے۔ جنہیں کتاب دی گئی مگر وہ اللہ کی آیات کا انکار کرنے اور ان کا مذاق اڑانے لگے۔ انہیں کتاب میں نشانیاں بتا دی گئیں لیکن جب حضور تشریف لائے تو انہوں نے اپنی گواہی دینے کی ذمے داری سے ہی منہ نہیں موڑا' اللہ کی آیات کو بھی جھٹلانے لگے۔ ان کے لئے اللہ نے فرمایا کہ یہ وہ گمراہ ہیں جن کے لئے آسمان سے فرشتے بھی بھیج دیئے جائیں تو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

حضور کو بطور خاص کوئی معجزہ نہیں عطا ہوا کیونکہ جنہیں اللہ نے ہدایت دی' وہ اس کے باوجود ایمان لے آئے اور یہ ہدایت یافتہ گمراہ' معجزوں کی بھی توجیہہ کرنے لگیں گے۔ اللہ نے فرما دیا کہ ان کا غم نہ کرو۔ یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ جسے ہم نے گمراہ کردیا' اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ یہ غفلت میں پڑے رہیں گے۔ یہاں تک کہ مقررہ دن آجائے گا' پھر یہ ایمان لائیں گے مگر اس وقت انہیں قبول نہیں کیا جائے گا۔

اب اس روشنی میں دیکھو' اسپین میں اہل کتاب تھے۔ وہ بدنصیب اہل کتاب جنہیں ہدایت سے محروم کر دیا گیا۔ جن لوگوں کو اللہ نے گمراہ کرکے ان کے حال پر انہیں چھوڑ دیا' وہ کیسے ہدایت پاسکتے ہیں۔ مگر وہ اہل کتاب بھی ہیں' جنہوں نے ہدایت سے منہ نہیں موڑا۔ اللہ نے فرمایا کہ ان میں ایسے بھی ہیں جو تقویٰ کرتے ہیں۔ جس سے منع کیا گیا' اس سے بچتے ہیں۔ ان لوگوں کے لئے خوش خبری ہے۔"

"مگر اس خطے پر۔۔۔ یعنی برصغیر ضر اس عنایت کی وجہ؟"

"اللہ کی مرضی۔ وہ جسے چاہے' ہدایت دے اور جسے چاہے گمراہ کردے۔ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں کیوں مبعوث فرمایا گیا۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ اللہ بے حد رحیم و کریم ہے۔ جہاں بہت زیادہ اندھیرا ہو' وہاں وہ روشنی ضرور بھیجتا ہے۔ جہاں روشنی بھیجی گئی اور لوگوں نے اسے اندھیروں میں چھپا دیا' وہاں سے وہ منہ پھیرلیتا ہے۔ بعثت سے پہلے کا عرب معاشرہ اس عہد کا سب سے بگڑا ہوا معاشرہ تھا۔ بت پرستی وہاں ہوتی تھی۔ شراب' جوا' جھوٹ' زنا ۔۔۔ کون سا گناہ تھا جو وہاں عام نہیں تھا۔ بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ گاڑ دیا جاتا تھا۔ جہالت کی ایسی تاریکی تھی کہ عقل ان تاریک دیواروں سے سر ٹکراتی پھرتی تھی اور راستہ نہیں ملتا تھا۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی رحمت اور ہدایت سے' اپنی سیرت طیبہ سے بے حد قلیل وقت میں اسے دنیا کا سب سے مہذب اور متمدن معاشرہ بنا دیا۔ اسے معجزہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ یہ ہدایت یافتہ گمراہوں کے لئے ایک مثال بھی تھی اور تنبیہہ بھی کہ دیکھو' ہم ایسے کایا پلٹ بھی کرسکتے ہیں لیکن تم نہیں بدلو گے۔ کیونکہ تم نے جانتے بوجھتے انکار کیا۔ سو تم دھتکار دیئے گئے۔

اب ذرا محمد بن قاسم کی آمد سے پہلے کے ہندوستانی معاشرے کا تصور کرو۔ وہاں بھی بت پرستی ہوتی تھی۔ اتنی بڑی تعداد میں دیوی دیوتاؤں کو کہیں نہیں پوجا گیا۔ یہاں تو زندہ انسانوں کو ان دیوی دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا تھا۔ عورت کا کوئی احترام نہیں تھا۔ وہ صرف استعمال کی چیز تھی' ملکیت تھی' جسے جوئے میں ہارا جاسکتا تھا۔ وہ خوب صورت تھی تو دیوداسی تھی' جسے دیوی دیوتاؤں کے نام پر مذہبی رہنما اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھا کر پامال کرتے رہتے تھے۔ یہاں انسانوں میں تفریق تھی۔ بہت بڑی اکثریت ایسی تھی جسے نفرت اور حقارت سے شودر کہا جاتا تھا' جس کے مقابلے میں غلاظت میں لتھڑا ہوا جوتا بھی اہمیت رکھتا تھا۔ یعنی انسان کی بے حرمتی اور اس کی عزت نفس کی پامالی ہوتی تھی جو اللہ کو سخت ناپسند ہے۔ یہ سب اس لئے تھا کہ ان تک ہدایت کی روشنی نہیں پہنچی تھی۔ سو اللہ نے رحمت فرمائی اور اپنے نیک بندوں کے ذریعے وہ روشنی بھیج دی۔

تو سمجھ رہے ہو نا کہ یہ بدترین کفر کی سرزمین تھی۔ یہاں چپے چپے پر کفر ہوتا تھا۔ یہاں گائے اپنے پیشاب اور گوبر سمیت متبرک اور مقدس تھی۔ گندگی اور ناپاکی کو پاکیزگی کا درجہ دیا جاتا تھا اور انسان کو شودر بناکر ناپاک تصور کرلیا گیا تھا۔ ایسا کفر تو کہیں نہیں ہوا۔ یہاں اللہ کی رحمت تو ہونی ہی تھی اور جس دن یہاں اللہ کی رحمت کا ظہور ہوا' اسی دن پاکستان کی داغ بیل پڑگئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ پاکستان صدیوں بعد ظہور میں آیا۔

اور اب دیکھو' دنیا اکیسویں صدی میں داخل ہو رہی ہے۔ مگر آج بھی بھارت کی تاریکی کا وہی حال ہے۔ اس خطے کے سوا دنیا میں بت پرستی کہیں نہیں ہوتی۔ سب کچھ بتوں سے مانگا جاتا ہے۔ صدیوں پہلے محمود غزنوی نے سومنات کا بت توڑ کر انہیں لمحہ فکریہ دیا تھا۔ احساس دلانے کی کوشش کی تھی کہ جو دیوتا اپنا دفاع بھی نہ کرسکے' وہ انہیں کیا دے گا۔ جنہیں اللہ نے ہدایت دی' وہ سمجھ گئے اور ایمان لے آئے' باقی گمراہ رہ گئے۔

لیکن اب صورت حال مختلف ہے۔ کفرستان کے سینے پر اب ایک پاکستان بھی موجود ہے۔ سو یقین کرلو کہ حق و باطل کا آخری معرکہ اسی میدان میں ہوگا۔ باطل کی

گردن کو پاکستان کی تلوار ہی کاٹے گی۔ یہی وجہ ہے کہ تمام بد اعمالیوں کے باوجود اللہ نے پاکستان پر ہمیشہ عنایت فرمائی' اسے قائم رکھا اور انشاء اللہ قیامت تک قائم رکھے گا۔ یہ ہے پاکستان کی اہمیت۔ اسے اللہ کی تائید و حمایت حاصل ہے۔ اس کی ظاہری فوج ہی نہیں' باطنی فوج بھی بہت طاقت ور ہے۔ تم تصور نہیں کرسکتے کہ کیسی کیسی عظیم المرتبت ہستیاں اس کی سربلندی کے لئے دعا کرتی ہیں اور جہاد میں شامل ہوتی ہیں۔"

میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایک طرف ایسی قدر اور اہمیت --- اور دوسری طرف اس کے اپنوں کی ایسی ناقدری' ایسی بے مہری۔ اس کے اپنوں میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ کچھ اپنے مفاد کے لئے اور کچھ دشمنوں کی خوشنودی کے لئے اس کی جڑیں کاٹنے میں مصروف ہیں۔ میرا دل پھٹنے لگا۔

"کاٹنے دو۔ وہ انشاء اللہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔" بابا عصر نے کہا "ملول اور مایوس نہ ہو۔ حوصلہ رکھو۔ اس سے محبت کرو اور اس کی عظمت کے حصول کی کوشش کرتے رہو۔"

"میں کیا اور میری بساط کیا۔ بے عمل ناکارہ ---"

"اس کا ایک عام مزدور بھی بے حد اہم ہے' اگر اس سے محبت کرتا ہے اور اس کے لئے جان دینے کا جذبہ رکھتا ہے۔ خود کو حقیر نہ سمجھو۔ ہاں اپنی اصلاح کرتے رہو۔ صرف اللہ کا خوف دل میں بٹھا لو تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"میری سمجھ میں اب بھی نہیں آیا کہ پاکستان سے محبت کی اتنی اہمیت کیوں ہے کہ اس سے محبت کرنے والوں کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے۔"

"اس پر بعد میں بات کریں گے" بابا عصر نے کہا "فی الحال تمہارے لئے اچھی خبر ہے --- بڑی خوش خبری۔"

میں ہمہ تن متوجہ ہوگیا "عطا کیجئے۔"

"اشرفی کا سفر شروع ہوگیا ہے" بابا عصر نے بتایا۔

میری آنکھوں میں اس فوجی کی صورت پھر گئی جسے میں نے وہ امانت سونپی تھی۔ میرا یقین سچا نکلا۔ میرا سینہ خوشی اور فخر سے پھول گیا۔ دھڑکنیں اللہ کا شکر ادا

کرنے لگیں۔

"یہی نہیں۔ صرف آدھا دن ہوا ہے اور وہ اشرفیاں اس وقت دس امانت داروں کے ہاتھوں سے گزر چکی ہیں۔" بابا نے مزید کہا۔

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا "اتنی جلدی ---؟"

"ہاں۔ تم نے امانت بہت بابرکت مسلمان کے سپرد کی تھی۔ اب تفصیل سن لو" بابا عصر مجھے امانت کے آگے بڑھنے کا حال لمحہ بہ لمحہ سناتے رہے۔ میری آنکھیں بار بار بھیگتی رہیں۔ دل میں امید کی کرنیں پھوٹتی رہیں۔ مایوسی ڈھلنے لگی۔

بابا عصر کے خاموش ہونے پر میں نے کہا "لیکن میں یہ سب کچھ نہیں لکھ سکوں گا۔"

"یہ تو ممکن بھی نہیں ہے" بابا عصر نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا "دیکھو --- یہ تمہاری اشرفیاں تو ہزاروں ہاتھوں سے گزریں گی انشاء اللہ۔ اتنے واقعات تو تم نہیں لکھ سکتے۔ ہاں ان میں چیدہ چیدہ اثر انگیز واقعات ضرور لکھ دینا۔ ایمان داری کے بھی۔ تاکہ لوگوں کو حوصلہ ہو اور بے ایمانی کے بھی تاکہ لوگوں کو عبرت ہو اور پتہ چلے کہ بدنصیبی کیا ہوتی ہے۔"

"یہ بھی ممکن نہیں ہے بابا" میں نے عاجزی سے کہا "کہانی بہت طویل ہو جائے گی۔ ان واقعات کے بغیر بھی اسے خاصا طویل ہونا ہے۔ کچھ پڑھنے والوں کو تو بہت بوریت ہوگی۔"

"ہونے دو۔ تمہیں اپنا کام کرنا ہے۔ تم اس کی پرواہ نہ کرو اور دیکھ لینا' انشاء اللہ یہ سب کو پسند آئے گی۔ اسے وہ لوگ بھی پڑھیں گے جنہیں کہانیوں سے دلچسپی نہیں اور یہ انشاء اللہ ان لوگوں تک بھی پہنچے گی جو پڑھنا نہیں جانتے تم بس اپنا کام کرو۔"

"وہ تو میں کروں گا لیکن واقعات میں زیادہ سے زیادہ دو تین شامل کرسکوں گا۔"

بابا عصر سوچ میں پڑگئے۔ چند لمحے بعد انہوں نے سر اٹھا کر کہا۔ "یہ ممکن نہیں کہ اس کہانی کی اشاعت کے بعد تم یہ واقعات ایک ایک کر کے لکھتے رہو اور لوگوں

تک پہنچاتے رہو؟

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"خیر' دیکھا جائے گا' ہو سکتا ہے کہ قارئین ہی فرمائش کر کے تمہیں اس پر مجبور کر دیں' چھوڑو اس بات کو" بابا نے کہا "یہ بتاؤ کہ ایک اشرفی تو تمہارے اختیار میں دی گئی تھی' تم سے یہ تو نہیں کہا گیا تھا کہ تم وہ بھی دے دو۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

میں سہم گیا۔ ان کا انداز اور لہجہ باز پرس کرنے والوں کا سا تھا۔ "پہلے ایک بات میری سمجھ میں آئی۔ اگر وہ اشرفی مجھے نہ دی جاتی تو شاید ابتدا میں ہی میری نیت خراب ہو جاتی۔ مگر اس اشرفی نے مجھے سہارا دیا۔ یہاں تک کہ میں پختہ ہوگیا۔ پھر میں نے سوچا' دوسروں کا بھی یہی حال ہوگا۔ چنانچہ میں نے وہ بھی آگے بڑھا دی۔"

"لیکن تم نے جسے دی' اسے اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔"

"بتا دیتا تو اس کا اختیار ختم ہو جاتا۔ وہ بھی آزمائش میں پڑ سکتا تھا۔"

بابا پھر مسکرائے "بالکل ٹھیک۔ یہ طے ہے کہ ہر امانت دار یہی سوچے گا اور یہی کرے گا۔ اور یہ بتا دوں کہ جو اپنا حصہ رکھنا چاہے گا' وہ دوسری اشرفی کو آگے بھی نہیں بڑھا سکے گا۔ اس کی نیت خراب ہو جائے گی اور وہ سعادت سے محروم ہو جائے گا۔ یہ یونہی ہوتا ہے۔ اچھا --- اب میں چلتا ہوں۔"

بابا اوجھل ہوگئے۔ مجھے احساس ہوا کہ ٹانگیں دکھ رہی ہیں۔ شاید اس رات ہم بہت زیادہ چلے تھے۔ مجھے یہ فکر بھی تھی کہ بابا نے نہ جانے مجھے کتنی دور چھوڑا ہوگا۔ یعنی ابھی مجھے مزید چلنا ہے لیکن میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو مجھے اطمینان ہوا۔ میں اپنی بلڈنگ کے سامنے کھڑا تھا۔

"آیئے!" میں نے حارث بن عثمان سے کہا۔ ہم دونوں گھر کی طرف چل دیے۔

○

اس پہلی رات کو ایک مہینہ گزر چکا تھا اور اس دوران میں بہت کچھ ہو چکا تھا۔ حارث بن عثمان نے عید کا دن ہمارے ساتھ گزارا تھا۔ لیکن اس کے بعد وہ بچوں کے اصرار پر بھی نہیں رکے تھے "تم خود سوچو" انہوں نے بے حد لجاجت سے ہمیں سمجھایا تھا۔ "اللہ کی مہمانی کا اعزاز کوئی کیسے چھوڑ سکتا ہے۔"

اس کے بعد کہنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں خود بھی بچوں کو سمجھانے لگا۔ "لیکن میرا وعدہ ہے کہ مجھے جب موقع ملے گا' تم سے ملنے آؤں گا۔"

بچے آبدیدہ تھے لیکن انہوں نے صبر کرلیا۔

میں البتہ حارث بن عثمان سے دن میں پانچ بار ملتا تھا اس لئے کہ اللہ کے فضل و کرم سے پنج وقتہ نمازی بن گیا تھا اور اسی مسجد میں نماز پڑھنے جایا کرتا تھا۔ عشاء کے بعد ہم چہل قدمی کرتے اور اس دوران میں بابا عصر سے ملاقات ہوتی تھی۔

اللہ کی بڑی عنایت تھی کہ اشرفی کا سفر جاری تھا بلکہ سست بھی نہیں پڑا تھا۔ وہ اشرفیاں اوسطاً" ہر روز دس بارہ امانت داروں تک پہنچ رہی تھیں۔

اس عرصے نے مجھے ایسی طمانیت سے نوازا تھا جو میرے لئے بالکل نئی تھی۔ مگر اس روز ۲۰ مارچ ۹۶ء کو میں اچانک فکرمند ہوگیا۔ گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ میرے کام کرنے کی رفتار بہت سست ہوگئی تھی۔ اس وقت سے اب تک میں ایک کہانی بھی نہیں لکھ سکا تھا۔

اس روز ناہید میری اسٹڈی میں آئی تو میری گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔ وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ میں نظریں چرانے لگا۔ "کیا بات ہے؟ کچھ پریشان ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں --- نہیں" میں نے گڑبڑا کر کہا۔

"یہ ہاں' اور نہیں کا کیا مطلب ہے؟"

"میں تمہاری پوچھ گچھ سے ڈر رہا ہوں۔"

"کیسی پوچھ گچھ؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"یہی کہ کہانی کب پوری ہوگی؟"

اس نے ملامت بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ "میں کبھی بلاوجہ پریشان کرتی ہوں تمہیں؟" اس کے لہجے میں بھی ملامت تھی۔

"اسی لئے تو پریشان ہوں میں" میں نے صاف گوئی سے کہا۔ "تم بلاوجہ پریشان کیا کرتیں تو مجھے گھبراہٹ ہوتی ہی نہیں۔ مگر اب تو وجہ ہوگی نا۔"

"کیا مطلب؟"

"بھئی ---- راشن کا مسئلہ ضرور کھڑا ہوگا۔ ایک مہینے سے اوپر ہوچکا سودا آئے ہوئے" میں نے کہا۔ پھر جلدی سے صفائی پیش کی۔ "اس دوسرے کام کی وجہ سے بھی فرق پڑا ہے۔"

"دوسرے کام کو کچھ نہ کہیں" اس نے بے حد غصے سے کہا۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا "کیسا خیر و برکت والا کام ہے۔ یہ تو ساری عمر کرتے رہیں' عافیت میں رہیں گے ہم سب۔"

میں گھبرایا کہ وہ طنز کر رہی ہے "طنز کر رہی ہو؟"

"نہیں۔ سچ کہہ رہی ہوں۔ میں عورت ہوں۔ یہ بات تم سے زیادہ سمجھتی ہوں۔ ایسی برکت دیکھنا تو کجا' میں نے سنی بھی نہیں۔ میں اسے کھونا نہیں چاہتی اسی لئے کہہ رہی ہوں کہ تم اسی دوسرے کام کو عمر بھر کرتے رہو' کبھی ترک نہ کرو۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"کچن میں چل کر دیکھو تو سمجھ میں آجائے گا۔ آٹے' دال' چاول گھی اور سب چیزوں کو دیکھو تو لگے گا کہ سودا آئے صرف تین دن ہوئے ہیں۔ کوئی چیز چوتھائی بھی خرچ نہیں ہوئی ہے۔"

میں نے کچن میں جاکر دیکھا' وہ ٹھیک کہہ رہی تھی "حیرت ہے" حالانکہ اس مہینے مہمانوں کا بھی تانتا بندھا رہا ہے "میں حیرت سے بڑبڑایا۔"

"اسی کو خیر و برکت کہتے ہیں۔"

اب میری طمانیت کی کوئی حد نہیں تھی۔ میں اسٹڈی میں آیا اور بیٹھ کر سکون سے لکھنے لگا۔

۹۶ء رخصت ہوتے ہوتے پرانی حکومت کو بھی رخصت کرا گیا۔ اشرفیوں کا سفر جاری تھا۔ بابا عصر نے اسمبلی ٹوٹنے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا "یہ بھی خیر و برکت اور اللہ کی تائید کا ثبوت ہے۔ اشرفیوں کا سفر جو جاری ہے" پھر وہ کچھ دیر سوچتے رہے۔ اس کے بعد اچانک انہوں نے کہا "ایک بات یاد رکھنا۔ کوئی بھی اس ملک کو طویل عرصے تک نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

"لیکن یہاں امریکا کی تائید کے بغیر کوئی حکومت نہیں کرسکتا" میں بولا۔

"کفر مت بکو" بابا نے مجھے بری طرح ڈانٹا "برا اور ظالم حکمراں' رعایا کے برے اعمال کی وجہ سے ان پر مسلط کیا جاتا ہے۔ یہ اللہ کا قہر ہے۔ اب یہ اسی مسبب الاسباب کی مرضی کہ سبب امریکا کو بنا دے یا کسی اور کو۔"

۹۷ء آیا اور اپنے ساتھ نئی حکومت لایا۔ لیکن نئے حکمراں نیم دلی سے کام کر رہے تھے اور اس طرح مختلف سمتوں میں دوڑ رہے تھے' جیسے ان کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا ہو اور انہیں کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا ہو۔

اشرفیوں کا سفر جاری تھا۔ اللہ کے فضل و کرم سے اس کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔

پھر ایک رات بابا عصر سے پاکستان کی محبت پر گفتگو ہوئی۔ انہوں نے کہا "تمہیں معلوم ہے کہ اسلام کتنی تیزی سے پھیلا۔ دیکھتے ہی دیکھتے' آدھی دنیا پر چھا گیا۔"

"جی ہاں۔" میں نے کہا "وہ بھی معجزہ لگتا ہے۔ لیکن اس کا پاکستان کی محبت سے کیا تعلق ہے؟"

"تم سنا اور سمجھا کرو۔ بعض باتوں کا تعلق بہت ---- بہت پیچھے سے ہوتا ہے۔ انہیں سمجھے بغیر سامنے کی بات سمجھ میں نہیں آتی" انہوں نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

"میں معافی چاہتا ہوں۔"

"اللہ نے دکھا دیا کہ اس کی مرضی ہو تو پوری دنیا پر اسلام کو غلبہ پانے میں ذرا

دیر بھی نہیں لگے گی۔ مگر اس کی مصلحت' اس کی حکمتیں اور اس کی مرضی کچھ اور ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ اگر وہ چاہتا تو سب ایک امت ہو جاتے لیکن وہ لوگ بھی تھے' جنہیں ان کے اعمال کے سبب اس نے گمراہ کر دیا۔ جن کے دلوں میں بیماری ڈال دی گئی' جن کے دلوں پر مہر لگا دی گئی۔ جو جاننے کے باوجود حق کا انکار کرتے رہے' وہ ایمان والوں کے لئے شیطان بن گئے۔ انہیں بھکانے کی کوششیں کرتے رہے۔ انہوں نے ترغیب اور لالچ کے ذریعے' طاقت کے ذریعے ایمان والوں کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کیں' انہیں بھکایا۔ وہ مومنوں کی آزمائش تھے اور ہیں۔ اس آزمائش سے ایمان کے ساتھ گزرنے کا صلہ جنت ہے۔ بھک جانے والوں کے لئے گمراہی ہے اور دوزخ کا عذاب۔ یہ کفرو ایمان کی جنگ ہے جو قیامت تک جاری رہے گی۔

سو کافر تو اپنی جگہ تھے ہی' اس جنگ کے نتیجے میں مشرک اور منافق بھی پیدا ہوئے۔ طرح طرح کے فتنوں نے جنم لیا۔ بے ایمانوں نے ایمان بیچے اور غداریاں کیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام کے ہر موڑ پر زوال اور شکست کے پیچھے کسی غدار کا چہرہ نظر آتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ منافق مسلمانوں کے سوا کسی امت میں نہیں ہوئے۔ ہر امت میں انکار کرنے والے بھی گزرے اور شرک کرنے والے بھی لیکن منافق نہیں۔ منافق جو بزدل ہوتے ہیں۔ اوپر سے ایمان والے بنتے ہیں اور اندر انکار کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ چپکے چپکے سازشیں کرتے اور شورشیں برپا کرتے ہیں۔ لیکن سوچو تو' منافقوں اور غداروں کا وجود اس امر کی دلیل ہے کہ اسلام دین برحق ہے۔ کیونکہ حق اٹل ہوتا ہے۔ اس کو کھلم کھلا کوئی زیر نہیں کر سکتا۔ یہ بے بسی باطل کو سازشیں کرنے' نقب لگانے اور چھپ کر وار کرنے پر مجبور کرتی ہے اور حق کبھی باطل کے ساتھ ایسا نہیں کرتا۔ اس لئے کہ وہ طاقت ور ہوتا ہے اور جانتا ہے کہ باطل کمزور ہے۔ وہ ہمیشہ للکارتا ہے کہ حق پر آجاؤ ورنہ تمہیں طاقت سے زیر کیا جائے گا۔"

بابا عصر کی یہ دلیل میرے دل میں اتر گئی۔ مجھے افسوس ہوا' خود پر شرم آئی کہ ایسی روشن دلیل بھی ہمیں نظر نہیں آتی۔

"منافق سب سے خطرناک ہے اس لئے کہ اسلام سلامتی کا دین ہے۔" بابا عصر

کہہ رہے تھے۔ "اسلام کسی کلمہ پڑھنے والے کو رد نہیں کرتا۔ خواہ اس کا عمل اسے منافق ثابت کر رہا ہو۔ چنانچہ اپنے خیال کے مطابق منافق کو بڑی سہولت حاصل ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اللہ نے اسے یہ سہولت دے کر اتمام حجت کر دیا۔ اس سے بڑی کوئی قوت کفر کو نہیں مل سکتی کہ ایک منافق مومنوں کی صفت میں گھسا' ان کی جڑیں کاٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن جاننے کے باوجود اس سے صرف محتاط رہا جاتا ہے۔ اسے رد نہیں کیا جاتا۔ اسے ختم نہیں کیا جاتا۔ صرف اس لئے کہ بظاہر وہ کلمہ گو ہے۔ یہ ہے اسلام کی شان اور طاقت اور اس کے باوجود وہ ایمان والوں کو گمراہ نہیں کرپاتا تو یہ دلیل ہے اسلام کے دین برحق ہونے کی۔ اور یہی اللہ کو منظور تھا۔"

"سبحان اللہ!" میں نے بے ساختہ کہا۔

"سو منافقوں نے کفار اور مشرکوں کے ساتھ مل کر ریشہ دوانیاں شروع کیں۔ مسلمانوں کے اتحاد کو نقصان پہنچایا۔ کمزور ایمان والوں کو گمراہ کیا۔ عصبیتوں کو فروغ دیا۔ عرب اور عجم کے درمیان نفاق ڈالا۔ اخوت کے تصور کو مجروح کیا۔ ہوس اقتدار ابھاری۔ غدار تلاش کئے اور انہیں سازشوں پر اکسایا۔ ظاہری طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر تو یہ سب کچھ نہ ہوتا اسلام قیامت تک دنیا پر چھایا رہتا۔ مگر قرآن کو سمجھ کر سوچو تو سمجھ میں آتا ہے کہ یہ سب اللہ کی تدبیر کا حصہ ہے۔ ایمان کی آزمائش تو سخت ہونی ہی ہے کہ اس کا اجر' اجر عظیم ہے۔ اسے تو باطل کے تمام حربوں کا مقابلہ کر کے استقامت پر رہنا ہے۔ حق کی تعداد' اسلحے اور طاقت میں کم ہونا ہے اور باطل کو زیادہ۔ اس کے بعد وہ باطل پر غالب آئے گا' تبھی تو حق ظاہر ہوگا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے باطل کو ہر ممکن طاقت دی' رعایت بھی دی (حالانکہ وہ اس کے لئے سزا ہے۔ گمراہی میں حد سے گزر جانا) تاکہ اس کے باوجود وہ شکست کا مزہ چکھے اور بدترین بے بسی میں مبتلا ہو۔

ایک اور زاویئے سے دیکھو۔ اگر اسلام پوری دنیا پر چھا جاتا تو لطف کیا رہتا۔ لطف اور سنسنی تو خیر اور شر کی اس جنگ سے ہے۔ جنت اور جہنم کی اہمیت بھی اسی سے ہے۔ اسی لئے تو اللہ نے شیطان کو ڈھیل دی۔ یوم حساب تک کی مہلت بخشی جبکہ شیطان کا کہنا تھا کہ جتنے بھی بندے تیرے راستے پر ہوں گے' میں انہیں بھکاؤں

گا اور دیکھ لینا کہ ان میں سے بیشتر گمراہ ہو جائیں گے۔ اللہ نے مہلت دیتے ہوئے فرمایا کہ وہ ان بہک جانے' گمراہ ہو جانے والوں سے دوزخ کو بھر دے گا اور ثابت قدم رہنے والوں کے لئے جنت ہوگی۔ یعنی فیصلہ اسی وقت ہوگیا تھا کہ نیکی' راستی اللہ کی طرف سے آسان اور شیطان کی وجہ سے بہت دشوار ہوگی۔ جبکہ بدی تو ہے ہی آسان۔ کیونکہ نفس تو ہر بشر کے ساتھ ہے۔ بدی سے روکنے والی طاقت صرف ایمان اور تقویٰ میں ہے۔

"خیر --- نتیجہ دیکھو۔ عصبیتیں پھیلیں۔ اسلامی بھائی چارے کے اصول سے انحراف ہوا۔ انتشار پیدا ہوا۔ اتحاد پارہ پارہ ہوا۔ اس کا جو نتیجہ نکلا' وہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے اور تم دیکھ بھی رہے ہو۔ مسلمان دھتکاری ہوئی بے گھر اور آوارہ گرد قوم کے ہاتھوں زیر ہوگئے۔ ان کے ہاتھوں جو استہزا کی حد کو پہنچے ہوئے سرکشی اور اللہ کی نافرمانیوں اور اپنی بے عملی' بزدلی اور میدان جنگ سے منہ موڑنے کی وجہ سے راندۂ درگاہ کیے گئے تھے۔ کیسی توہین' کیسی ذلت ہے یہ۔ لیکن ذلت پانے والوں کو شاید اس کا احساس بھی نہیں۔ عرب اور عجم کی باہمی آویزشوں اور نفرتوں نے انہیں نا اہل بنا دیا۔ اب عالم اسلام کی سرداری کے لئے کون بچا۔ پاکستان' جو بہت پہلے منتخب کرلیا گیا تھا۔

یہ ہے پاکستان کی اہمیت۔ اس سرزمین کو اللہ نے خاص اسلام کے لئے منتخب فرمایا۔ یہ وہ واحد ملک ہے جو دین کے نام پر' دین کی خاطر وجود میں آیا۔ یہ نام بے شک کسی نے سوچا' مگر میں کہتا ہوں کہ یہ آسمانوں پر طے ہوا اور اس کے بعد اسے تجویز کرنے والے پر القا کیا گیا۔ یہ ایک مبارک ساعتوں میں وجود میں آیا۔ یہ امر آپ اللہ کی تائید اور اس کے مبارک ہونے کا ثبوت ہے۔

اب کوئی اس ملک سے محبت کرتا ہے' اسے اپنی جان سے بھی زیادہ اہم سمجھتا ہے تو درحقیقت وہ دین سے ہی محبت کر رہا ہے نا۔ اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کر رہا ہے نا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی محبت بہت بڑا وصف شمار ہوتا ہے اور پاکستان کی ابتدائی نسل کو پاکستان سے عشق تھا اس لئے کہ انہوں نے پاکستان بنتے دیکھا تھا۔ قربانیاں جو دی گئیں' ان کے سامنے تھیں۔ وہ پاکستان کی اہمیت کو بھی سمجھتے تھے۔ بعد

میں آنے والی نسلوں کو وہ محبت گھٹی میں پلائی جانی چاہئے تھی۔ جو کچھ ابتدا میں دیا جائے' وہ دیرپا ہوتا ہے۔ شخصیت بننے کے بعد وہ تاثیر نہیں رہتی۔ خرابی یہ ہوئی کہ سیاست نے اپنا کردار ادا نہیں کیا۔ اقتدار والے صرف اپنے اقتدار کی فکر میں رہے۔ نسلوں کی تعمیر کی فکر کسی نے نہیں کی۔ یہ ایک نظریاتی ملک تھا۔ یہاں نظام تعلیم کو خاص طور پر اس نظریئے کے تحت استوار کرنا چاہئے تھا۔ یہاں ایک لازمی مضمون ہونا تھا۔ پاکستان --- ابتدا سے آخر تک --- مگر یہاں مذہبی جماعتیں اپنے عقیدے کی بنیاد پر الیکشن لڑتی رہیں۔ اور دوسرے سیاست داں امپورٹیڈ نظریات کو استعمال کرتے رہے۔ پاکستان سے محبت کا پرچار کسی نے نہیں کیا۔ کہیں ووٹ لینے کے لئے اسلام کا نام استعمال ہوا تو کہیں ترقی پسندی کا' سوشلزم کا۔ اور اسے بھی اپنے قول و فعل میں تضاد کے ذریعے بدنام اور ناکام کر دیا گیا۔ یہ دہرا نقصان ہوا' لوگ ہر چیز سے بیزار ہوگئے۔

مذہبی جماعتیں کہتی ہیں کہ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا۔ یہاں اسلامی نظام نافذ ہونا چاہئے۔ میں کہتا ہوں' اس کام کے لئے تمہاری بھی ضرورت نہیں --- کم از کم سیاسی انداز میں۔ ارے یہ تو ہونا ہے۔ اس ملک میں اسلام کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تو اللہ کی مرضی ہے' جو ٹل نہیں سکتی۔ پاکستان کو غیر اہم کیوں کہتے ہو۔ جبکہ اللہ نے اسے اہمیت دی ہے۔ پاکستان سے محبت کرو تو دین سے محبت کرو گے۔ پاکستان ہے تو اس خطے میں دین ہے' ورنہ یہ کفرستان ہے۔ پاکستان ہے تو ہم آزاد مسلمان ہیں ورنہ خدانخواستہ ہندوؤں کے غلام ہو جائیں گے۔ پاکستان سے محبت کرو گے تو یہ اسلام سے محبت بھی ہوگی اور اسلام کی خدمت بھی۔ مگر ان میں بیشتر تو وہ ہیں' جنہوں نے پاکستان کی مخالفت کی ---"

"اس لئے کہ قائداعظم کوئی مذہبی آدمی نہیں تھے۔ اور ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا جا رہا تھا" میں نے کہا۔

"اللہ کی مرضی۔ وہ جسے چاہے سعادت عطا کردے" بابا عصر بولے "دنیا اسباب کا کارخانہ ہے۔ اللہ مسبب الاسباب ہے۔ انگریز بھی مسلمانوں سے ڈرتا تھا۔ انہیں آزاد رہ کر پنپنے اور طاقت پکڑنے کا موقع کیسے دیتا۔ اس کے نزدیک ہندو ناقابل اعتبار

تھے لیکن مسلمان بہت خطرناک۔ محمد علی جناح ہی ایک ایسے شخص تھے جو ظاہر میں اس کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ وہ انگریز کو قدرے بے ضرر لگتے تھے۔ بھئی اللہ جس سے جو کام لینا چاہے' لے لیتا ہے۔

بنیادی چیز پاکستان سے محبت کرنا ہے۔ اس سے محبت کرو۔ اس کے لئے اپنے مفاد ترک کرکے محنت کرو۔ اسے ناقابل تسخیر بناؤ۔ یہ دین کا قلعہ ہے۔ یہاں کبھی کوئی اور نظام نہیں آسکتا۔ اب عمل کے لحاظ سے ہی دیکھ لو۔ اسلام کا نام لینے والے اس کے نام پر کلمہ گو بھائیوں کو کاٹ ڈالتے ہیں۔ مغربی نظام کے حامی سیاست داں' خود غرض' مفاد پرست اور لٹیرے ہیں۔ پاکستان سے محبت کرنے والا نسبتاً" بہتر ہے۔ اس میں تعصب ضرور ہے مگر وہ بھی سیاست دانوں کے ایکس پلائی ٹیشن کا نتیجہ ہے۔ اس کی ایک وجہ پاکستان سے محبت کا نامکمل ہونا ہے۔ پاکستان کو اللہ کی طرف سے نعمت سمجھو' اس کی اہمیت سمجھو۔ ہندوؤں کی غلامی کا تصور کرو تو ہر پاکستان ہر پاکستانی سے محبت کرے گا۔ یکجہتی کی فضا پیدا ہوگی۔ میں صرف ایک بات کہتا ہوں۔ اسلام متحد کرتا ہے' منتشر نہیں۔ سب سے بڑی ضرورت اتحاد ہے۔ سب سے اہم پاکستان ہے۔ اس کی حفاظت خود اللہ فرما رہا ہے۔ اس کا قیام بھی معجزہ اور اس کا قائم رہنا بھی معجزہ۔"

میں دم بخود تھا۔ حارث بن عثمان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "تم لوگوں کو تو دنیا کے تمام مظلوم مسلمانوں کے آنسو پونچھنے ہیں۔ پہلے ایک دوسرے سے محبت تو کرلو۔ ایک دوسرے کے لئے آنسوؤں کا سامان کرنے کی بجائے ایک دوسرے کے آنسو پونچھنا تو سیکھ لو۔

اب شاید تمہاری سمجھ میں پاکستان سے محبت کی اہمیت آگئی ہوگی۔" بابا عصر نے کہا۔ "اب آج کے اشرفیوں کے سفر کی روداد سنو ـــــ"



ساری رات بابا عصر نے جو واقعات سنائے' ان میں سے ایک کے بارے میں' میں نے کہا اور کہا کہ اسے ضرور لکھو گا۔

گھر پہنچ کر میں نے قلم کھولا اور پیڈ اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ اسی لمحے بابا عصر کی آواز میرے کانوں میں گونجی اور اس کے ساتھ ہی منظر تبدیل ہوگیا۔ میں سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا۔ میرا قلم پیڈ پر رواں تھا۔



وہ پورے چاند کی رات تھی۔ ہر چیز چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔ دور دور تک سب کچھ بہت روشن تو نہیں' البتہ بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو نہ دیکھ پاتے۔ یہی وجہ تھی کہ زرینہ کو الجھن ہو رہی تھی۔ اس رات برکت بہت الجھا ہوا نظر آرہا تھا۔ زرینہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ برکت کے چہرے اور آنکھوں کے تاثرات رہ رہ کر بدل رہے تھے۔ ابھی وہ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہا ہوتا۔ ایک پل میں اس کی آنکھوں میں محبت کی جگہ ایک عجیب سی حسرت لے لیتی۔ اور اگلے ہی لمحے ان میں نفرت دہکنے لگتی۔ وہ دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگتا۔ اور اس کے بعد پھر اچانک وہی محبت کا لمحہ آجاتا۔

"برکت' تم مجھے بابا سے مانگ کر تو دیکھو" بالاخر زرینہ نے چپ توڑی۔

"تم اس کا انجام جانتی تو ہو جیناں" برکت نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

"ہاں' جانتی ہو۔" زرینہ نے آہ بھر کے کہا "اسی لئے تو کہتی ہوں کہ کہیں بھاگ چلیں۔ خدا کی قسم' میں تمہارے ساتھ جھونپڑی میں بھی خوش رہوں گی' پر تم مانتے نہیں۔"

"کیسے مان لوں۔ چوہدری جی کی زمین بہت بڑی ہے اور ان کے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ ان کی زمینوں سے باہر بھی بہت دور تک جاتے ہیں۔ ان کے کتوں کے دانت اور پنجے بہت تیز ہیں اور انسان کا گوشت انہیں سب سے زیادہ پسند ہے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو؟" زرینہ نے جھرجھری لے کر کہا۔

"مسئلہ یہی ہے کہ تم کچھ بھی نہیں جانتیں" برکت نے ذرا چڑ کر کہا "ہم ابھی پوری جان سے بھاگنا شروع کر دیں' سورج نکلنے تک بھاگتے رہیں۔ پھر دن بھر بھی بھاگتے رہیں تو سورج تمہارے بابا چوہدری صاحب کی زمینوں میں ہی غروب ہوگا۔ پھر

فرض کرلو' ہم ان کی زمینوں سے دور نکل جائیں' کہیں کوئی جھونپڑی بنا کر رہنا شروع کردیں تو بھی کسی دن چوہدری جی کا ان دیکھا ہاتھ ہمیں دبوچ لے گا۔ تم حویلی میں بند کردی جاؤ گی اور مجھے زندہ چوہدری صاحب کے خون خوار کتوں کے سامنے ڈال دیا جائے گا۔" برکت نے گہری سانس لی اور قدرے بلند آواز میں بولا "خدا کی قسم' میں مرنے سے نہیں ڈرتا مگر کتوں کی خوراک بننے میں بے عزتی کا احساس ہوتا ہے۔ موت ملے تو شہادت کی ملے۔"

"تو کیا سچ مچ بابا کے پاس ایسے کتے ہیں؟" زرینہ نے سہم کر پوچھا۔

"ہاں' وہ پھٹے ہوئے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں چھوڑتے۔"

زرینہ کانپنے لگی "مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا۔"

"تمہیں تو بہت کچھ معلوم نہیں ہے" برکت نے کہا اور اسے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔

زرینہ کو اس کی نگاہوں سے خوف آنے لگا۔ وہ نگاہیں اس کے لئے نئی تھیں۔ وہ جیسے اسے 'بے لباس کئے دے رہی تھیں اور اس کے ادھ کھلے ہونٹوں سے اس کے چمک دار دانت جھانک رہے تھے۔ وہ بہت سفاک لگ رہا تھا' جیسے وہ کوئی بھیڑیا ہو

"ایسے کیوں دیکھ رہے ہو مجھے؟" زرینہ نے گھبرا کر کہا "مجھے ڈر لگ رہا ہے تم سے۔"

ایک دم ان نگاہوں کا تاثر بدل گیا "میں کیسا ہی لگوں۔ تم مت ڈرا کرو مجھ سے۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

"مگر ایسے کیوں دیکھتے ہو؟"

"انسان ہوں نا۔"

"میری سمجھ میں آج تمہاری باتیں نہیں آرہی ہیں" زرینہ منمنائی۔ اسے برکت سے چھپ چھپ کر ملتے ہوئے چھ مہینے ہوگئے تھے۔ برکت نے کبھی اسے ایسے ویسے چھوا تک نہیں تھا۔ مگر آج کسی کسی لمحے اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ اسے بھنبھوڑ ڈالے گا۔ یوں تو وہ خود چاہتی تھی کہ وہ اسے اپنی بانہوں میں ایسے بھینچے کہ اس کی سانسیں رک جائیں لیکن محبت سے --- ان نظروں کے ساتھ نہیں' یہ تو کوئی اور چیز ہے "تمہیں ہوا کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جیناں' آج ہم آخری بار مل رہے ہیں" برکت نے دھماکا کیا۔ "اس کے بعد کبھی نہیں ملیں گے۔"

زرینہ بھونچکی ہوگئی "کیوں بھئی؟"

"اس لئے کہ میں یہاں نہیں ہوں گا۔"

"کیوں؟ کہاں جاؤ گے؟"

"شاید مرجاؤں۔ یا پھر فوج میں بھرتی ہو جاؤں۔"

"کیا ہوگیا ہے تمہیں؟" زرینہ پریشان ہوگئی۔

"چوہدری جی نے ناجو کو حویلی میں طلب کیا ہے" برکت پھٹ پڑا۔

"تمہاری بہن کو؟" اس کی آنکھوں میں اثبات دیکھ کر زرینہ بولی "کیوں؟ حویلی میں کام کرنے کے لئے؟"

برکت نے اس زور سے ہونٹ دانتوں سے دبائے کہ خون نکل آیا "نہیں --- اپنے نفس کے کتے کے آگے ڈالنے کے لئے۔"

زرینہ کی سمجھ میں پہلے تو کچھ بھی نہیں آیا۔ سمجھ میں آیا تو اسے یقین نہیں آیا "یہ کیسے ممکن ہے؟"

"ناجو کوئی پہلی لڑکی نہیں ہے اس جاگیر کی' نہ آخری ہے جسے یہ حکم ملا ہو۔ اس جیسی سینکڑوں جاچکی ہیں تمہاری حویلی میں۔ تم نے اپنی پوری حویلی دیکھی ہی کب ہے" برکت نے تلخ لہجے میں کہا۔

زرینہ پانی پانی ہوگئی۔

"چوہدری کا حکم ہے کہ ناجو سورج نکلنے سے پہلے خود حویلی پہنچ جائے۔ ورنہ اس کے بندے اسے اٹھا لے جائیں گے زبردستی۔"

اس بار زرینہ کی سمجھ میں بہت کچھ آگیا۔ وہ برکت کی نظروں کا مفہوم بھی سمجھ گئی اور جو اس نے پوچھا تھا کہ مجھے ایسے کیوں دیکھتے ہو اور اس نے جواب میں کہا تھا' انسان ہوں نا --- تو اس کا مطلب بھی وہ سمجھ گئی۔ اس نے جان لیا کہ اس وقت برکت کے اندر کیسا طوفان اٹھ رہا ہے۔ برکت کو خیال آیا ہوگا کہ اس رات کی تنہائی میں وہ اپنی بہن کے لٹنے سے پہلے اسے لوٹ سکتا ہے۔ پیشگی بدلہ لے سکتا ہے

اور یہ عین انصاف ہوگا۔ یہ سب سوچ کر ایک لمحے کے لئے اس کا بدن کانپا۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ پرسکون ہوگئی "میں حاضر ہوں برکت۔ اگر مجھ سے تمہیں کچھ سکون مل سکتا ہے تو ضرور حاصل کرلو۔" وہ بولی۔

برکت شرمندہ نظر آنے لگا "یہ خیال آیا تھا مجھے ــــ پر میں ایسے کر تو نہیں سکتا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں جیناں۔"

زرینہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا جہاں محبت ہی محبت تھی۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ بولی "اب تم کیا کرو گے؟"

"یہ پوچھو کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں" برکت نے کہا پھر خود ہی جواب دیا "میں نے سوچا تھا کہ ناجو کو حویلی جانے سے تو میں نہیں روک سکوں گا۔ چوہدری سے کبھی کوئی اپنی بہن یا بیٹی بلکہ بیوی کو بھی نہیں بچا سکا۔ پر میں مزاحمت کروں گا' جان دے دوں گا' بے غیرتی قبول نہیں کروں گا۔ پر رب کو یہ منظور نہیں ہے۔"

"کیا ہوا؟"

"میں نے سوچا' تم سے آخری بار مل لوں۔ یہاں آرہا تھا کہ راستے میں ایک مسافر مل گیا۔ اس نے مجھے ایسی امانت دے دی جسے پہنچائے بغیر میں مرنا بھی نہیں چاہتا اور اسے امانت دار تک پہنچانے میں نہ جانے کتنا وقت لگے اور اس کے بعد میں مزاحمت کی موت تو نہیں' ہاں حرام موت مرسکتا ہوں۔ راستے میں' میں نے سوچا اس سے اچھا ہے کہ شہادت کی آرزو کروں۔ فوج میں بھرتی ہو جاؤں اور کبھی گاؤں واپس نہ آؤں۔ بتاؤ میں کیا کروں؟" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

زرینہ نے اس کے آنسو اپنی انگلی سے پونچھے اور پھر اپنی انگلیوں کو چوم لیا۔ پھر اس نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے لبوں سے لگالیا "میں تمہارے بغیر جی نہیں سکتی برکت۔ اتنی محبت کرتی ہوں تم سے۔ پر بہتر یہی ہے کہ تم ناجو کو بچاتے ہوئے مر جاؤ۔ تمہارے بعد میں بھی جان دے دوں گی' یہی پاپا کی سزا ہوگی۔"

"پر اب میں ایسا نہیں کرسکتا۔ اس امانت کی وجہ سے۔ یہ تو وطن کی امانت ہے نا۔ اس سے میں کیسے منہ موڑوں۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ مجھے اپنے وطن سے اتنا پیار ہے۔ یہ مٹی مجھے اپنی عزت' آبرو اور جان سے بھی زیادہ پیاری ہے۔ اس کے

لئے میں ذلت اٹھا کر بھی جی سکتا ہوں۔"

زرینہ کو تجسس ہوا "دکھاؤ تو' کیا ہے؟" اس نے کہا۔

برکت نے اشرفیاں نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ چوہدری کے آدمی اس پر قیامت کی طرح ٹوٹ پڑے۔



چوہدری مہردین کے وہ چاروں آدمی اصل میں برکت کے گھر کے پہرے پر تھے۔ یہ چوہدری کا اصول تھا کہ جس گھر میں بلاوا بھجوا دیتا' مقررہ وقت تک اس گھر پر نظر رکھی جاتی تھی۔ یہ محض احتیاط تھی کیونکہ بھاگنے کی ہمت تو کسی کو نہیں ہوتی تھی مگر چوہدری اپنے شکار کو کھونے کا قائل نہیں تھا۔ وہ یہ خطرہ مول لیتا ہی نہیں تھا کہ اس کی مطلوبہ لڑکی کو نکالنے کا کوئی موقع متاثرہ خاندان کو ملے۔ ایک بار بھی ایسا ہوتا تو اس کی ناک ہمیشہ کے لئے نیچی ہو جاتی اور چوہدری مہردین کو اپنی ناک بہت عزیز تھی۔

رات کے پہرے پر اصغر' نادر' آکا اور عاقل تھے۔ ولایت کا گھر الگ تھلگ تھا۔ ادھر ادھر بس کھیت ہی کھیت تھے۔ چوہدری کا حکم پہنچنے کے ساتھ ہی پہرا ڈال دیا گیا تھا۔ وہ چاروں بے فکر تھے۔ مگر آدھی رات کے بعد برکت کے گھر سے انہوں نے کسی کو نکلتے دیکھا۔ چاندنی کی وجہ سے انہیں پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی' وہ ولایت کا بیٹا برکت تھا۔

اصغر سب سے سینئر ہونے کے ناتے انچارج تھا۔ آکا نے اس سے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا کہ کیا برکت کو روکا جائے۔ اصغر نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ بلاوجہ ہنگامہ کرنے سے فائدہ۔ لیکن خود اصغر کو بھی تجسس تھا کہ اس وقت برکت کہاں جا رہا ہے۔ پھر اس نے سوچا' ممکن ہے' رفع حاجت کے لئے جا رہا ہو۔ اصغر آکا کو پسند نہیں کرتا تھا۔ آکا میں وحشت بہت تھی۔ مارپیٹ اس کا شوق تھا۔ چوہدری کا آدمی تھا اس لئے اس کا شوق پورا ہوتا رہتا تھا۔ خون بہانے میں اسے خاص لطف آتا تھا۔

ایک بجے پہرا دینے کے لئے دوسری ٹولی آگئی۔ اصغر نے چلتے چلتے آنے والوں کو ہدایات دیں۔ "پانچ بجے تک ناجو باہر آجائے۔ تو خاموشی سے اس پر نظر رکھنا۔ اسے حویلی کے سوا کہیں نہیں جانا ہے۔ ادھر ادھر جاتی نظر آئے تو اٹھا لینا اور حویلی لے آنا۔"

"اور وہ باہر نہیں آئے تو؟"

اصغر نے سوال کرنے والے کو ملامتی نظروں سے دیکھا۔ "اوئے تم کب سے ہو چوہدری جی کے پاس۔ اتنا بھی نہیں معلوم" اس کے لہجے میں بھی ملامت تھی۔ "اوئے پانچ بجے تک لڑکی باہر نہ آئے تو گھر میں گھس کر اٹھا لینا اسے۔ آئی تمہیں سمجھ کہ نہیں؟"

اس کے بعد وہ چاروں حویلی کی طرف چل دیئے۔ حویلی سے کچھ دور کھیت کے باہر سے گزرتے ہوئے انہیں کسی کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ بولنے والا سرگوشی میں بول رہا تھا۔ لیکن اتنے گہرے سناٹے میں تو آدمی سوچے بھی تو وہ سنائی دینے لگتا ہے۔ پھر نسوانی آواز بھی سنائی دی تو وہ رک گئے اور چوکنے پن سے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ اس کے بعد وہ آوازوں کی سمت چلنے لگے۔ اچانک ٹاہلی کے درخت کے نیچے انہیں وہ دونوں بیٹھے نظر آگئے۔

برکت پر ٹوٹ پڑنے والوں میں آکا سب سے آگے تھے۔ زرینہ برکت کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اصغر نے اس کے دونوں ہاتھ جکڑ لئے۔ اس وقت اس کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ زرینہ پر کب سے اس کی نظر تھی لیکن چوہدری صاحب کی دھی کو وہ کن انکھیوں سے بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہاتھ جکڑنے کے بعد اس نے زرینہ کو بے بس کرنے کے بہانے لپٹا لیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اپنے نصیب کو کوس رہا تھا۔ اس وقت وہ اکیلا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ زرینہ سے اپنی خاموشی کی قیمت وصول کرسکتا تھا اور سلسلہ چل نکلے تو پھر وہ کب رکتا ہے۔ مگر ایسا کچھ نہیں تھا۔ یہاں تو تین مسٹنڈے اور تھے۔ اس جھنجلاہٹ نے اس کی گرفت سخت کر دی۔

"تمہاری یہ جرات کہ مجھ کو ہاتھ لگاؤ" زرینہ نے نفرت سے کہا۔ وہ چوہدری

کی بیٹی تھی اور اسے جکڑنے والا چوہدری کا غلام۔

"آپ کا فیصلہ چوہدری صاحب کریں گے۔ آپ بس گھر چلو" اصغر نے بوجھل آواز میں کہا۔

زرینہ نے خود کو چھڑانے کے لئے زور لگایا۔ اس بہانے اصغر کو کچھ اور قربت کا موقع مل گیا۔ اس نے اس سے فائدہ اٹھایا "نہ بی بی' ایسے نہیں کرتے" اس نے لطف لیتے ہوئے کہا۔

"لیکن ---- لیکن یہ اسے مار ڈالیں گے ---- برکت کو ----" زرینہ نے ہانپتے ہوئے کہا۔

اس پر اصغر کو کچھ ہوش آیا۔ واقعی ---- وہ برکت کو بری طرح مار رہے تھے اور ان میں آکا بھی تھا جو شوقیہ بندے کو مار بھی سکتا تھا۔ اس نے انہیں ڈانٹا۔ "اوئے ---- مارنا نہیں ہے۔ بس پکڑ کر حویلی لے چلنا ہے۔ روکو ہاتھ۔"

حسب توقع احتجاج بھی آکے نے ہی کیا "لیکن بھا' اس نے چوہدری جی کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے" اس نے لذت لیتے ہوئے کہا۔

"تو یہ چوہدری کا مجرم ہے" اصغر بولا "اور ان کے مجرم ان تک پہنچنے سے پہلے مرجائیں تو اسے لانے والے بھی زندہ نہیں بچتے۔"

عاقل اور نادر کے ہاتھ فوراً رک گئے لیکن آکا نے چھوڑتے چھوڑتے بھی اپنی کچھ تسلی کرلی۔ اس وقت تک برکت نڈھال ہوچکا تھا۔

برکت کی جان چھوٹی تو زرینہ کو اپنا ہوش آیا۔ اصغر نے اسے عجیب انداز میں جکڑ رکھا تھا۔ وہ شرم سے نڈھال ہوگئی۔ اسے غصہ بھی شدید آیا "چھوڑو مجھے۔ ہاتھ نہ لگانا" اس نے اصغر کو ڈانٹا۔ اصغر نے بادل ناخواستہ اسے چھوڑ دیا۔

وہ سب حویلی کی طرف چل دیئے۔ حویلی کے قریب پہنچ کر اصغر رک گیا۔ اس نے عاقل سے کہا "بی بی کا وہاں اس طرح جانا چوہدری جی کو پسند نہیں ہوگا۔ تم جاکر انہیں بتاؤ۔"

وہ تینوں برکت کو لے کر چلے گئے۔ اصغر زرینہ کو لے کر وہیں رک گیا۔

چوہدری کو جگانا کار دارد تھا۔ بڑی مشکل سے اسے اٹھایا گیا لیکن اس کا موڈ خراب ہوگیا۔ بہرحال وہ اس بڑی ہال نما بیٹھک کی طرف چل دیا جسے وہ دربار کہتا تھا۔ وہاں اسے اپنے تین خاص بندے نظر آئے لیکن برکت کو دیکھ کر اسے حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا" اس نے مزاحمت کی تو مجھے جگانا کیوں ضروری تھا؟" وہ عاقل پر برس پڑا۔

"یہ بات نہیں ہے چوہدری جی!" عاقل نے اسے کان میں اصل صورت حال بتائی۔ چوہدری کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس نے سب سے پہلے حویلی کے پہرے دار کو ادھر ادھر کیا تاکہ زرینہ کو راز داری کے ساتھ گھر میں لایا جاسکے۔ اس کے بعد وہ دربار میں آیا۔ اس بار اصغر بھی اس کے ساتھ تھا۔

چوہدری اپنی چوکی پر بیٹھ گیا "اب بتاؤ' کیا بات ہے؟" اس نے کڑے لہجے میں کہا۔

"سرکار' میں تو اسے جان سے مار دیتا پر آپ کے لئے چھوڑ دیا" آکا بولا۔ "یہ سرکار وہاں بی بی کے ساتھ ---"

"بس ---" چوہدری ہاتھ اٹھا کر دہاڑا "میں سمجھ گیا۔ میرے بھوکے کتے بدنصیب ہیں کہ انہیں صرف چار زبانیں ملیں گی۔"

یہ سن کر وہ چاروں کانپنے لگیں "چوہدری جی! آپ تو جانتے ہیں کہ ہم آپ کے بندے ہیں" اصغر گڑگڑایا۔

"اسی لئے تو زندہ چھوڑ رہا ہوں" چوہدری نے سفاکی سے کہا۔ "شکر کرو کہ جاہل ہو ورنہ ہاتھ بھی کٹوانے پڑتے۔"

"پر چوہدری صاحب' بات پھیلنے کے ڈر سے ہی تو میں پیچھے رک گیا تھا" اصغر نے صفائی پیش کی۔

چوہدری کے چہرے پر نرمی نظر آئی "وہ تو ٹھیک ہے پر زبان کبھی پھسل بھی جاتی ہے۔"

"ایسا نہیں ہوگا سرکار۔ ہم آپ کے وفادار ہیں۔"

چوہدری چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا "ٹھیک ہے۔ پر یاد رکھنا' زبان کھولنے والے

کی نسل ہی ختم کردوں گا میں۔"

"آپ بے فکر رہیں چوہدری جی!" وہ چاروں بیک آواز بولے۔

"ٹھیک ہے۔ اب تم تینوں جاؤ' بس اصغر یہاں رکے گا۔"

ان تینوں کے جانے کے بعد چوہدری نے اصغر سے کہا "اب ذرا اسے میرے قریب تو لا۔"

اصغر برکت کو دھکیلتا ہوا چوہدری کے نزدیک لے گیا۔ چوہدری نے برکت کو نفرت سے گھورا "اتنی بڑی جرات!"

صدیوں کا محکوم لرز اٹھا "چوہدری جی' خدا کی قسم میں نے کبھی جیناں کو چھوا بھی نہیں' ہم بس ملتے رہے ہیں۔"

چوہدری آپے سے باہر ہوگیا۔ غلام آقا زادی کا نام اتنی بے تکلفی سے لئے جا رہا تھا "مجھے نہیں معلوم۔ تیرا اسے اتفاقاً' دیکھ لینا بھی بہت بڑا جرم ہوتا۔"

"اور آپ گاؤں کی بہو بیٹیوں کو حویلی بلوا سکتے ہو؟" محکوم تڑپ کر بولا۔

"ہماری بات اور ہے ---"

"تم خدا تو نہیں ہو چوہدری" اس بار برکت نے بڑی نفرت سے کہا۔

اس سے پہلے کہ چوہدری کچھ کہتا' وفادار اصغر نے برکت کے پوری قوت سے لات رسید کی "اوئے --- زبان لڑاتے ہو چوہدری جی سے۔"

برکت چوہدری کے قدموں میں پہلو کے بل گرا لیکن چوہدری کی نظریں اس کے وجود پر نہیں' قالین پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور حرص و طمع گلے مل رہی تھیں۔

قالین پر دو بہت چمک دار اشرفیاں پڑی تھیں۔ وہ برکت کی جیب سے گری تھیں۔ چوہدری نے جھک کر انہیں اٹھا لیا۔ ہاتھ میں اشرفیاں لیتے ہی وہ حیران ہوا۔ اشرفیاں اس کے اندازے سے بہت زیادہ بھاری تھیں۔ پھر اسے اور حیرت ہوئی۔ وہ قالین پر پڑی تھیں اور اس نے انہیں بالکل صاف دیکھا تھا۔ ان پر کچھ لکھا نہیں تھا مگر اب ان پر اللہ لکھا نظر آرہا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ دوسری طرف کلمہ لکھا تھا۔

چوہدری کچھ خوف زدہ ہوگیا۔ لیکن پھر تجسس خوف پر حاوی آگیا۔ اس نے سوچا' ممکن ہے مجھے نظر کا دھوکا ہوا ہو۔ سوتے سے اٹھا ہوں نا' اب وہ لالچ کے تحت ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہ سونے کی ہیں۔ پر سونا اتنا زیادہ نہیں تھا۔ پھر بھی وہ جانتا تھا کہ وہ بہت قیمتی ہیں۔ وہ انہیں الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ حروف اوپر لکھے ہوئے نہیں تھے' وہ اشرفیوں کے اندر کئی رنگوں سے ابھرے ہوئے تھے اور ان سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ پھر اشرفیوں کا وزن بھی گواہی دیتا تھا کہ اندر یقیناً قیمتی جواہرات کی تحریر ہے اور شعاعوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہیرے' زمرد' نیلم اور یاقوت بہت نایاب قسم کے ہیں۔ یہ کروڑوں کا ---- بلکہ شاید اربوں کا مال ہو۔

چوہدری اپنی عزت' جیناں کو بھی بھول گیا۔ ان اشرفیوں کے سوا اسے کسی بات کا خیال نہیں تھا۔ سوال یہ تھا کہ اس کنگلے برکت کو یہ کہاں سے مل گئیں۔ اس نے برکت کو کڑی نظروں سے دیکھا "تو تو چور بھی ہے" وہ بولا "یہ کہاں سے چرا کر لایا ہے؟"

"میں چور نہیں ہوں چوہدری' یہ مجھے کسی نے امانت دی ہے۔"

"کیسی امانت؟"

برکت اسے تفصیل بتانے لگا۔ چوہدری غور سے سنتا رہا۔ اس کا دل کہتا تھا کہ برکت سچ بول رہا ہے پھر اسے یہ بھی یاد آیا کہ فرش پر پڑی تھیں تو وہ عام سی اشرفیاں تھیں' جن کے اندر کچھ لکھا ہوا نہیں تھا۔ برکت سب کچھ بتا چکا تو وہ بولا "تو یہ ایک اشرفی تیری ہے اور دوسری تو کسی امانت دار کو دے گا؟"

"جی نہیں۔ میں دونوں آگے بڑھا دوں گا" برکت نے کہا اور پھر اس کی وجہ بتائی۔

"یہ اور بھی اچھا ہے" چوہدری نے خوش ہو کر کہا "تو یہ اشرفیاں مجھے دے دے۔"

"یہ نہیں ہوسکتا۔ یہ میں تمہیں نہیں دوں گا چوہدری!"

چوہدری کی نرمی اور اس کا تحمل حیرت انگیز تھا "اوجھلے' میں بے ایمان نہیں ہوں۔ ایک رکھوں گا' دوسری آگے بڑھا دوں گا۔"

"نہیں چوہدری۔ یہ پاکستان کی ہیں' پاکستان کے لئے اہم ہیں۔ یہ میں تمہیں کیوں دوں؟"

"اوئے پاکستان ہمارا ہے۔ ہم پاکستان کے ہیں" چوہدری نے سینہ تان کر کہا۔

"اسی کا تو افسوس ہے" برکت نے نفرت سے کہا "یہ میں تمہیں نہیں دوں گا۔"

"دیکھ' یہ تو ہیں ہی میرے قبضے میں۔ میں زبردستی بھی لے سکتا ہوں۔ بس ان کا ہی احترام کر رہا ہوں۔ ان میں اللہ کا نام اور کلمہ لکھا ہوا ہے نا' اس لئے۔ تو یہ مجھے ہنسی خوشی دے دے۔"

بات معقول تھی' برکت نے سوچا ---- چوہدری بھی خوف خدا والا ہے۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کے اندر کسی نے اسے سمجھایا کہ یہ خوف خدا نہیں' سزا کا خوف ہے۔ چوہدری ڈرتا ہے کہ اللہ ناراض ہوا تو سب کچھ چھین لے گا اور پھر وہ ایک اشرفی رکھے گا تو دوسری کا لالچ بھی کرے گا۔ اس نے نفی میں سرہلایا "یہ میں تمہیں اپنی خوشی سے کبھی نہیں دوں گا۔"

"دیکھ برکت' اس کے بدلے میں تجھے زندگی بخش دوں گا۔ بس تو یہاں سے چلے جانا اور کبھی واپس نہ آنا۔"

"زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے چوہدری!"

چوہدری سوچتا رہا۔ وہ اشرفیاں کرامت والی چیز بھی تھیں اور بہت قیمتی بھی تھیں۔ ڈرنے کی بات یہ تھی کہ ان میں اللہ اور کلمہ لکھا ہوا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا' اس معاملے میں زبردستی اچھی نہیں۔ کوئی بہت بڑا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس نے نرم لہجے میں کہا "نا جو تیری بہن ہے نا؟"

برکت کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس نے اثبات میں سرہلا دیا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ اسے بھی چھوڑ دوں گا۔ کبھی اس کے متعلق سوچوں گا بھی نہیں۔ تو یہ اشرفیاں مجھے سونپ دے۔ مجھے امانت دار بنا دے ان کا۔"

برکت کے لئے وہ بہت بڑی ترغیب تھی۔ ایک لمحے کو ---- صرف ایک لمحے کو اس کا جی چاہا کہ ہاں کہہ دے۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ شرمندہ ہوگیا۔ یہ تو وطن سے

غداری ہو گی۔ لیکن نہیں' اس نے سوچا۔ ایک سہولت تو ہے۔ چوہدری بے ایمان ہوا تو اشرفیاں میرے پاس واپس آجائیں گی۔ اس میں نقصان کا تو کوئی پہلو ہے بھی نہیں۔ بہن کی عزت بھی بچ جائے گی۔ وہ ہاں کہنے ہی والا تھا کہ اس کے اندر ایک آواز ابھری۔ مگر یہ سوچ کر اس سے پہلے تو ہی بے ایمان ثابت ہو جائے گا۔ تو ان اشرفیوں کی قیمت جو وصول کر رہا ہے۔ تو پاکستان کی عزت' خود انحصاری اور استحکام اور دین کی سربلندی کی علامت اشرفیوں کو چوہدری جیسے بدکار' بے ایمان اور خائن آدمی کو سونپ کر ان کی بے حرمتی کرنا چاہتا ہے --- اور وہ بھی اپنی غرض کے لئے۔ نہیں برکت' بہن کی عزت ملک کی عزت سے بڑی نہیں۔

"میں یہ تمہیں دے ہی نہیں سکتا چوہدری!" برکت نے سر اٹھا کر' چوہدری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

مگر چوہدری ڈر اور خوف کے باوجود ان اشرفیوں سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا اور وہ زبردستی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کچھ سوچنے کے بعد اس نے کہا "سن --- جو زمینیں تیرے زیر کاشت ہیں' وہ میں تیرے نام کردوں گا' بس تو راضی ہو جا۔"

"چوہدری --- میں رشوت لینے والا نہیں ہوں۔"

چوہدری پھر سوچنے لگا۔ اس کے شاطر سیاسی ذہن نے اسے سمجھایا کہ اس کے پاس ترپ کا اکا ہے --- آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ ایک سیاسی نظیر بھی قائم ہو جائے گی۔ الیکشن جیتنا بھی آسان ہو جائے گا۔ مگر یہ پتہ کھیلنے میں اس کی انا برکت کے پیروں تلے کچل جاتی۔ پھر بھی غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ فائدہ توہین کے مقابلے میں بہت بڑا ہے۔ سیاسی فائدے کے علاوہ کروڑوں اربوں کی وہ اشرفیاں بھی اسے مل رہی ہیں۔ اس نے کہا "برکت' میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایک اشرفی صحیح امانت دار کو پہنچاؤں گا۔ دیکھ' میں ملک و قوم کو نقصان کیسے پہنچا سکتا ہوں۔ اور سن' میں تجھے اپنا داماد بنانے کو بھی تیار ہوں۔ میں جیناں کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دے دوں گا۔"

یہ سن کر اصغر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے سوچا' چوہدری جی پاگل ہو گئے ہیں۔ جو چیز اختیار میں ہے' اسے مانگ رہے ہیں۔ اس کی بڑھ چڑھ کر قیمت لگا رہے ہیں۔

ادھر برکت بھی بھونچکا رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چوہدری اس حد تک بڑھ جائے گا۔ ایک لمحے کو اس کا دل یوں دھڑکا جیسے ناچ اٹھا ہو۔ اسے جیناں سے بہت محبت تھی اور وہ اسے ناقابل حصول سمجھتا تھا اور اب وہ اسے مل رہی تھی۔ زمین آسمان مل رہے تھے مگر فوراً ہی اسے خیال آیا کہ جینا کا حصول بہن کی عزت سے بڑھ کر تو نہیں ہے اور جس بات کے لئے وہ لڑ رہا ہے' وہ بہن کی عزت سے بھی بڑی ہے۔ وطن کے استحکام اور دین کی سربلندی کے معاملے میں وہ ایمان دار ہو کر بھی بے ایمان بن جائے' یہ تو خسارے کا سودا ہے۔ اس نے مستحکم لہجے میں کہا "نہیں چوہدری' یہ اشرفیاں کسی قیمت پر تمہیں نہیں سونپوں گا۔"

چوہدری کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ترپ کا اکا بھی رائیگاں ہو گیا تھا۔ اب اسے فیصلہ کرنا تھا۔ اس نے اشرفیوں پر نظر ڈالی اور فیصلہ ہو گیا۔ اشرفیوں کا لالچ ڈر اور خوف پر حاوی ہو گیا۔ اس نے بے حد نفرت سے برکت کو دیکھا۔ "میں تو تجھے آزما رہا تھا۔ اشرفیاں تو میرے پاس ہی ہیں' مجھے تیری اجازت کی ضرورت نہیں" اس نے زہریلے لہجے میں کہا "اور تو نے ثابت کر دیا کہ تو بہت ڈھیٹ اور اڑیل ہے۔ اب میں تجھے ایسی موت دوں گا جس کا تو نے تصور بھی نہیں کیا ہو گا" پھر وہ اصغر کی طرف مڑا "اصغر' اسے لے جا کر بند کر دے اور ہاں' ناجو آجائے تو اسے بنا سنوار کر میرے کمرے میں لے آنا --- اور اسے بھی ہاتھ پاؤں باندھ کر لے آنا۔ اسے میں ایک بہت خوب صورت تماشا دکھاؤں گا ------ مفت --- بغیر ٹکٹ کے" یہ کہہ کر وہ اپنی خواب گاہ کی طرف چل دیا۔

بستر پر لیٹ کر چوہدری اشرفیوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔ اسی عالم میں اسے نیند آگئی۔



صبح اصغر نے برکت کو بندی خانے سے نکالا تو دھوپ نکل چکی تھی۔ اصغر نے

اس کے پاؤں کھولے اور بولا "چل اوئے' اب مفت میں زندہ ناچ گانے والی انگلش فلم دیکھنے کے لئے تیار ہو جا۔" برکت کے تیور بدلتے دیکھ کر اس نے ریوالور لہرایا۔ "کوئی گڑبڑ مت کرنا۔ مجھے تجھ سے کوئی محبت نہیں ہے اور ٹانگوں پر گولی چلانے سے چوہدری صاحب کبھی نہیں روکتے۔"

برکت کا خون کھول رہا تھا۔ وہ یقیناً بھڑ جاتا لیکن اسے اپنے دونوں فیصلے یاد تھے۔ سب سے پہلے تو اسے اشرفیوں کی فکر کرنی تھی کیونکہ بندھے ہوئے ہاتھ پیروں کے باوجود وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اشرفیاں اس کے پاس واپس آچکی ہیں۔ گویا اشرفیاں سونگھنے والے نے جو کچھ کہا تھا' درست تھا اور اسے جلد از جلد انہیں آگے بڑھانا تھا۔ دوسرے یہ کہ اسے حرام موت سے بچنا تھا اور شہادت کی آرزو میں جینا تھا۔

"چل آگے بڑھ" اصغر نے اسے دھکا دیا۔

اچانک برکت خوف زدہ ہوگیا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کیا دکھانے کے لئے لے جایا جا رہا ہے۔ اس کی روح تک کانپ گئی۔ اے اللہ' میری مدد فرما۔ اس نے آسمان کی طرف چہرہ اٹھاتے ہوئے سرگوشی کی لیکن اب ایک قدم اٹھانا بھی اسے دوبھر لگ رہا تھا۔ اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ پھانسی کے مجرم پھانسی کے گھاٹ تک کیسے جاتے ہوں گے۔

اصغر کا رخ حویلی کے اس حصے کی طرف تھا جو اصل حویلی سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ وہاں مہمان خانہ تھا۔ اس طرف جانے کی اجازت صرف چوہدری کے خاص ملازموں کو تھی یا پھر اسے جسے چوہدری صاحب بلائیں۔ وہ چوہدری کا عشرت کدہ تھا۔



چوہدری' برکت کا فیصلہ کرنے کے بعد حویلی کے زنان خانے میں جانے کے بجائے اپنی مہمان خانے والی خواب گاہ میں چلا آیا تھا۔ اس وقت وہ جاگ چکا تھا لیکن متورم آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس کی نیند پوری نہیں ہوئی ہے۔ وہ مسہری پر نیم دراز تھا۔ سہمی ہوئی ناجو بھی مسہری پر سمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ چوہدری اسے بھوکی نگاہوں سے

دیکھ رہا تھا۔

اس لمحے اصغر' برکت کو لے کر خواب گاہ میں داخل ہوا؟ لے آیا چوہدری جی!" اس نے اعلان کیا۔

"کرسی پر بٹھا کر اس کے پاؤں بھی باندھ دے" چوہدری نے حکم دیا۔ اصغر برکت کے پاؤں باندھ چکا تو چوہدری نے کہا "اب باہر بیٹھ جا۔ جب تک میں نہ بلاؤں' کسی کو اندر نہ آنے دینا۔"

اصغر باہر چلا گیا۔ ناجو نے بھائی کو سامنے پاکر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا تھا۔ برکت نے بڑی عاجزی سے کہا "چوہدری' خدا کا خوف کر۔"

چوہدری نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں "ایسا پھل دار تو میں نے کوئی درخت بھی نہیں دیکھا برکت!" وہ بولا۔ پھر ناجو کی طرف مڑا "ان کپڑوں میں تو بہت اچھی لگتی ہے۔ پر میں جانتا ہوں' ان کے بغیر تو تجھ پر نگاہ بھی نہیں ٹھہرے گی۔"

ناجو یوں تھرتھرائی جیسے اس کی روح جسم سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہو۔

"دیکھا برکت' اشرفیاں بھی میری' تیری بہن بھی میری۔ اور تجھے کیا ملا؟ یہ ہے ضد کا انجام "چوہدری نے کہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس نے سو کر اٹھنے کے بعد اشرفیوں کو دیکھا ہی نہیں ہے۔ اس نے اشرفیاں نکالنے کے لئے بغیر دیکھے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا۔ اگلے ہی لمحے اس کے حلق سے دل دوز چیخ نکلی اور اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنے تکیے کے نیچے والا ہاتھ پکڑلیا۔ وہ مسلسل چیخے جا رہا تھا۔

چوہدری نے جھٹکے سے ہاتھ کھینچا تھا تو تکیہ الٹ گیا تھا۔ برکت نے حیرت سے دیکھا۔ تکیے کے نیچے دو سیاہ بچھو موجود تھے۔ یہ منظر ناجو نے بھی دیکھا جو پہلے ہی سہمی ہوئی تھی۔ ان بچھوؤں کو دیکھ کر تو وہ بے ہوش ہی ہوگئی۔ برکت نے بے تابی سے زور لگایا۔ لیکن رسی کی بندشیں بہت سخت تھیں۔ وہ بے بسی سے دیکھتا رہا۔ اسے ڈر تھا کہ بچھو کہیں ناجو کو ڈنک نہ مار دیں۔ ایسے سیاہ اور بڑے بچھو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ اسے بہت زہریلے لگ رہے تھے۔

چیختے ہوئے چوہدری نے بھی حیرت سے ان بچھوؤں کو دیکھا۔ اس کی سمجھ میں

نہیں آرہا تھا کہ اشرفیاں کہاں گئیں --- اور یہ بچھو کہاں سے آگئے۔ پھر اذیت نے اسے سوچنے سمجھنے کے قابل بھی نہیں چھوڑا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بچھو اس کے جسم پر چڑھ گئے اور بار بار اس کے جسم کے مختلف حصوں پر ڈنک مارتے رہے۔ ہر بار چوہدری کے حلق سے فلک شگاف چیخ نکلتی۔ زہر ایسا تھا کہ اس کا چہرہ تک سیاہی مائل نیلا ہوگیا تھا۔

گھبرایا ہوا اصغر کمرے میں داخل ہوا تو یہ منظر دیکھ کر گھبرایا۔ "ارے --- ڈاکٹر کو لا --- جلدی سے ---" اذیت سے چیختے ہوئے چوہدری نے حکم دیا۔ اصغر الٹے پاؤں کمرے سے نکلا۔ "یہ --- ان بچھوؤں کو --- تو مار دے" چوہدری نے پھر پکارا لیکن یا تو اصغر نے سنا نہیں یا وہ بچھو اسے بہت خوفناک لگے۔ وہ کمرے سے نکلا چلا گیا۔

بچھو ڈنک مارتے رہے۔ پھر بے ہوش ناجو کے پاس سے گزر کر نیچے چلے گئے۔

برکت حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور چوہدری اب یوں چلا رہا تھا جیسے اس کے جسم میں جہنم کی آگ دہک رہی ہو۔ "ارے --- میں مرا --- ہائے ربا --- ربا --- مجھے بچا لے---"

اچانک چوہدری خاموش ہوگیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے پائنتی کی سمت دیکھنے لگا۔ وہاں اسے ایک نورانی چہرے والی ہستی نظر آرہی تھی "آپ --- آپ میری مدد کریں نا---" وہ گڑگڑایا۔

"آیا تو میں تمہاری مدد کرنے ہی تھا لیکن تم نے تو کچھ بچایا ہی نہیں۔"

"کچھ کریں---" چوہدری اور گڑگڑایا۔

"کوئی حصہ تم نے ایسا پاک چھوڑا ہی نہیں کہ تمہاری جان نکال سکوں اے ناپاک آدمی۔"

"تت --- تو --- تو --- آ ------ آپ---"

"ہاں۔ میں موت کا فرشتہ ہوں۔"

"مم --- مجھے --- آپ --- کی --- ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر --- مجھے ---بچا لے --- گا۔"

"تمہارا وقت پورا ہوچکا ہے" موت کے فرشتے نے کہا "اب تمہیں کوئی نہیں بچا سکتا۔ ڈاکٹری دوا تمہاری اذیت اور بڑھا دے گی۔ تم خود موت مانگنے لگو گے۔"

برکت حیران تھا کہ چوہدری کس سے باتیں کر رہا ہے۔ اسے کمرے میں اور کوئی نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ چوہدری اب یوں لرز رہا تھا' جیسے جسم اس کے قابو میں نہ ہو۔ اس کی چیخیں بہت دردناک تھیں لیکن اب اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ اس سے چیخا بھی نہیں جا رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ اس کی تشنج کی کیفیت اور شدید ہوگئی تھی۔

اصغر ڈاکٹر کو لے آیا۔ ڈاکٹر نے چوہدری کو ایک نظر دیکھتے ہی مایوسی سے سر ہلایا "زہر پوری طرح اثر کرچکا ہے۔ بہت مشکل ہے" اس نے کہا "میں انجکشن لگا رہا ہوں مگر بہتر یہی ہے کہ اسپتال لے جاؤ۔ حالانکہ میرے خیال میں یہ بچیں گے پھر بھی نہیں۔"

ڈاکٹر انجکشن لگا کر چلا گیا مگر چوہدری کی اذیت اور بڑھ گئی۔ اس نے موت کے فرشتے سے کہا "میں سمجھ گیا۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ تم میری جان نکال لو نا" وہ گڑگڑانے لگا۔

اس بار اصغر کو یقین ہوگیا کہ چوہدری پاگل ہوگیا ہے۔ وہ ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔

فرشتے نے کہا "کیسے نکالوں' کوئی راستہ بتاؤ۔ ایسے تو میں تمہیں نجات نہیں دے سکتا۔"

"کک --- کیسے --- بب --- بتاؤں --- راستہ؟"

"یہ نزع کا وقت ہے۔ توبہ اب قبول نہیں ہوسکتی۔ نیکی تم کر نہیں سکتے کہ توفیق کا دروازہ بھی بند ہوگیا ہے" فرشتے نے کہا۔ "اب زبان سے کچھ کرو' جو کرنا چاہیے۔ تب راستہ بنے گا۔ کچھ ہاتھوں کو بھی کام میں لاؤ ---"

"کیا --- کک --- کروں؟"

"یہ تو تمہیں ہی سوچنا ہے" فرشتے نے بے رخی سے کہا۔

چوہدری سوچتا اور ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ اس کی نظر برکت پر --- اور پھر ناجو پر پڑی۔ اس نے اصغر کو حکم دیا کہ برکت کو کھول دے "اور میری اس --- بیٹی کو

ہوش میں لا" یہ کہتے ہوئے اسے یہ خوش آئند احساس ہوا کہ یہ سب کچھ کہتے ہوئے اس کی اذیت یک لخت موقوف ہوگئی تھی لیکن خاموش ہوتے ہی اذیت پھر لوٹ آئی' وہ چیخنے لگا۔

اصغر ہچکچایا کہ پاگل چوہدری کی بات مانے یا نہ مانے۔ کیا پتہ' ہوش میں آنے کے بعد وہ اسی بات پر اس کی کھال میں بھس بھروا دے "اص --- غر --- سنتا نہیں ہے" چوہدری نے گرجنے کی کوشش کی۔

اصغر کو تعمیل کرنا ہی پڑی۔ برکت کے ہاتھ پاؤں کھول کر وہ ناجو کی طرف بڑھا اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

چوہدری نے برکت سے کہا "برکت --- میں ہل بھی نہیں سکتا۔ تو یہ سمجھ لے کہ میں تیرے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہا ہوں۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دے۔"

برکت کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا' وہ بولا "چوہدری' اللہ تجھے معاف کرے' میں نے تجھے معاف کیا۔"

چوہدری نے مظلومیت سے فرشتے کی طرف دیکھا "اب میری مشکل آسان کردو۔"

"ابھی بات بنی نہیں" فرشتے نے کہا "کچھ اور کوشش کرو۔"

چوہدری سوچتا رہا۔ ناجو ہوش میں آگئی تھی۔ چوہدری نے اصغر سے کہا کہ وہ زنان خانے سے گھر کے تمام افراد کو بلا لائے۔ پھر وہ ناجو سے گڑگڑا کر معافی مانگنے لگا۔

"میری بیٹی' مجھے معاف کردے۔"

فرشتے نے کہا "کیا بس یہی دو ہیں جن پر تو نے ظلم کیا ہے؟"

چوہدری پوری جان سے کانپ گیا۔ ظلم کی کہانی تو بہت بڑی تھی۔ گھر گھر پھیلی ہوئی تھی "م --- میں --- سس --- سب سے --- معافی مانگ لوں گا۔"

اتنے میں گھر کے لوگ آگئے۔ اس کی بیوی' بیٹی زرینہ اور اکلوتا بیٹا منصور۔ اور رشتے دار بھی۔ وہ ان سب سے معافی مانگنے لگا پھر اس نے اصغر سے کہا "سب آدمیوں کو ایک کام پر لگا دو۔ میری جاگیر میں' تمہیں ہر جگہ جا کر معافی مانگنی ہے۔ کہنا'

میں اس قابل ہوتا تو خود آتا۔ خدا کے نام پر' مجھے معاف کر دیں۔"

اس کے گھر والے اور رشتے دار رو رہے تھے۔ چوہدری کا چہرہ اور پورا جسم سیاہ ہوچکا تھا۔ وہ سب جانتے تھے کہ اب چوہدری بچے گا نہیں۔

"اب تو میری مشکل آسان کرو" چوہدری نے فرشتے سے التجا کی۔

"ابھی بات نہیں بنی۔ تم نے برکت سے کچھ وعدہ کیا تھا؟"

"ہاں۔ میں پورا کردوں گا۔ بات پکی کردوں گا۔ تم اب مجھے موت دے دو۔"

"ایسے نہیں۔ اپنے معاملات خود نمٹا کر جاسکتے ہو تم' ایسے نہیں۔"

چوہدری نے اپنی بیوی سے کہا "میں جیناں کی شادی برکت سے کر رہا ہوں" وہ بیٹے کی طرف مڑا "منصور' جلدی سے قاضی کو بلا۔ جلدی کر۔ فوراً" نکاح پڑھوا دے میرے بیٹے!" وہ فرشتے کی طرف مڑا "اب تو ٹھیک ہے؟"

"اور وصیت ---"

"وہ میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں۔"

"وارث کسے بنایا ہے؟"

"اپنے بیٹے منصور کو۔ سب جائداد زمین اسی کے نام کر دی ہے۔"

"کیوں؟ زمین کس کی ہے؟" فرشتے نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"میری ہے۔"

"کیسے؟"

"میرے پرکھوں سے چلی آرہی ہے' باپ سے مجھے ملی۔"

"غلط ہے۔ سب غلط" فرشتے نے تیکھے لہجے میں کہا "تمہارے پرکھوں کو انگریزوں نے دی تھی نا۔ جانتے ہو کیوں' غداری اور غلامی کے صلے میں۔ اور کیا تم نہیں جانتے کہ زمین اللہ کی ہے۔ وہ جسے چاہے' وارث بنا دے اور وارث سرکش اور نافرمان ہو تو اللہ زمین اس سے چھین کر کسی اور کو وارث بنا دیتا ہے۔"

"تو میری زمین ---"

"یہ نہ کہو۔ کہو اللہ کی زمین۔ یہ اسی کی ہونی چاہیے جو اس پر محنت کرے۔"

"ٹھیک ہے' جو جس زمین پر فصل اگا رہا ہے' اب وہی اس کا مالک ہوگا۔"

"وصیت نامہ لکھواؤ اور اس پر دستخط کرو' یوں ہاتھوں سے راستہ بنے گا۔"

چوہدری نے اپنے وکیل کو اور اپنے تمام مزارعوں کو طلب کرلیا۔ اسی دوران میں قاضی صاحب آچکے تھے۔ انہوں نے برکت اور زرینہ کا نکاح پڑھا دیا۔

دوپہر تک تمام کام مکمل ہوگئے۔ وصیت نامے پر دستخط ہوگئے۔ اس کے بعد ہی چوہدری کی جان نکلی۔

چوہدری کی تدفین کے بعد برکت نے دوسرے مزارعوں کو جو اب زمین دار بن چکے تھے' وہ اشرفیاں دکھائیں اور ان کے بارے میں بتایا اور کہا "اب تم سب پر اللہ کی رحمت ہوچکی ہے۔ ان اشرفیوں کی خیرو برکت کا یہ ثبوت ہے کہ ظلم مٹ گیا اور ہم سب کو وہ کچھ مل گیا جس کا ہم خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے۔ اب سوچو کہ ان اشرفیوں کے قومی خزانے میں پہنچنے کے بعد انشاء اللہ ملک میں کیا کچھ ہوگا۔ میرا بس چلے تو انہیں آج ہی ان کی آخری منزل پر پہنچا دوں۔ مگر ہم صرف اتنا کرسکتے ہیں کہ کل کے مزارع اور آج کے ہم زمین دار ان اشرفیوں کو جلد از جلد یہ جاگیر پار کرا کے آگے بڑھا دیں۔ پہلے مرحلے میں یہ اشرفیاں چاچا کریم کو سونپتا ہوں۔"

چاچا کریم نے اشرفیوں کو چوما' آنکھوں سے لگایا اور اپنے پڑوسی عطا محمد کی طرف بڑھا دیں۔

کیسی ناقابل یقین بات ہے کہ رات ہونے تک اشرفیوں کی امانت ایک ہزار سے زائد ہاتھوں سے گزر چکی تھی۔



میں نے قلم بند کرکے رکھا اور اپنے لکھے ہوئے کو پڑھنے لگا۔ اسے پڑھ کر میرا وجود عجیب طمانیت اور خوشی سے بھر گیا۔ میں ان اشرفیوں کے بارے میں سوچنے لگا۔

اشرفیوں کے اس سفر کو شروع ہوئے ڈیڑھ سال سے اوپر ہوچکا تھا۔ اس سفر کی ہر کہانی بابا عصر نے مجھے سنائی تھی۔ میں ہزاروں کہانیاں سن چکا تھا مگر انہیں لکھ نہیں سکتا تھا۔ لکھتا تو لاکھوں صفحے ہو جاتے۔ کچھ باتیں ہر کہانی میں مشترک تھیں۔ ایک تو یہ کہ کسی امانت دار نے اپنے حصے کی اشرفی نہیں رکھی تھی۔ دوسری یہ کہ ہر امانت

دار ضرورت مند تھا۔ ہر ایک کی ضرورت بڑی تھی۔ مگر ملک و قوم کی محبت میں اور اس کے مفاد میں ان میں سے ہر ایک نے اپنی ضرورت کو پس پشت ڈال دیا۔ پھر بے ایمان بھی تھے --- اور وہ سب ایک جیسے تھے۔ ان کے دل میں کسی ضرورت کی وجہ سے بے ایمانی نہیں آتی تھی' ہوس انہیں مجبور کر دیتی تھی اور ایک مشترکہ بات یہ تھی کہ اشرفی جہاں بھی گئی تھی' وہاں خیرو برکت چھوڑ آئی تھی۔

ایک اور بات سامنے آئی تھی۔ بے ایمانوں کو وہ اشرفیاں اپنی خواہش' اپنی ہوس کے مطابق نظر آتی تھیں۔ ان میں بعض تو ایسے بدنصیب تھے کہ انہیں ان میں نہ اللہ کا نام لکھا نظر آیا' نہ کلمہ طیبہ۔ کسی کو وہ بہت قیمتی دھات کی ڈالیاں لگیں۔ کسی کو ان میں ہیرے جواہرات نظر آئے۔ اور سب کے ہوس ناک ردعمل بھی مختلف اور عجیب تھے۔ کسی نے انہیں سینت کر رکھنا چاہا' کسی نے ہیرے جواہرات نکالنے کے لئے انہیں توڑنے کی کوشش کر ڈالی۔ کوئی انہیں فروخت کرنے کے لئے جوہری کے پاس پہنچ گیا اور کوئی کسی ملک کے سفارت خانے۔ قصہ مختصر یہ کہ عجیب عجیب کہانیاں' عجیب عجیب پہلو سامنے آتے تھے۔

آج کے واقعے نے مجھے جس وجہ سے متاثر کیا وہ یہ تھی کہ وہ بے حد پہلو دار تھا۔ اس بار اشرفیوں کی خیرو برکت نے بہت بڑھ کر اجتماعی رخ اختیار کیا تھا۔ اس بار بدترین ظلم اپنے انجام کو پہنچا تھا۔ اور بے شمار لوگوں کو ظلم سے نجات ملی تھی۔ یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ اللہ کی پکڑ کے سامنے طاقت ور سے طاقت ور انسان کتنا بے بس اور حقیر ہوتا ہے۔ اس بد نصیبی کا بھی پتا چلا تھا کہ توبہ اور توفیق کے دروازے بند ہونے سے پہلے انسان اللہ سے رجوع نہ کرے تو ایسی عظیم رحمت اور کرم سے بھی محروم رہ جاتا ہے جو برسہا برس کے گناہ گار کو توبہ کے ایک سچے لمحے میں بخش دیتی ہے' دھو کر پاک کر دیا جاتا ہے۔ اور یہ عبرت ناک بات بھی سامنے آئی تھی کہ گناہ گار کی موت کتنی دشوار اور اذیت ناک ہوتی ہے۔

بہرکیف اس سفرنامے نے مجھے بہت پرامید کر دیا۔ مجھے صاف نظر آرہا تھا کہ بے برکتی اور بدحالی کی طویل رات ختم ہونے کو ہے اور میرے وطن کے افق پر خیرو برکت' استحکام' خود انحصاری اور اللہ کی تائید کا سورج طلوع ہونے والا ہے۔

بس مجھے اس صبح کا انتظار تھا --- اور پوری قوم کو اس کے لئے اللہ سے دعا کرنی تھی۔



۲۷ رمضان ۱۴۱۸ھ کو اشرفیوں کے سفر کو دو سال ہو چکے تھے۔ اب ہمارے معمول میں فرق پڑ گیا تھا --- بابا عصر سے اب ملاقات ہر روز نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ اب اس میں باقاعدگی بھی نہیں رہی تھی۔ کبھی دو تین چار دن بعد مل جاتے اور کبھی دو دو ہفتے ہو جاتے اور ملاقات نہ ہوتی۔ بہرحال جب بھی وہ ملتے' اتنے دنوں کے اشرفیوں کے سفر کی تمام روداد وہ مجھ تک پہنچا دیتے۔ البتہ میرا معمول اب بھی وہی تھا۔ عشاء کے بعد چہل قدمی کی عادت ہوگئی تھی۔

--- مئی ۹۸ء کو بھارت نے ایٹمی دھماکہ کر دیا۔ اس کے اگلے روز بابا عصر سے ملاقات ہوئی۔ ہمارے درمیان اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ اس روز میں جس سے بھی ملا تھا' اس سے یہی گفتگو ہوئی تھی۔ پاکستان کو دھماکہ کرنا چاہئے یا نہیں۔ تقریباً" پوری قوم اس پر متفق تھی کہ پاکستان کو دھماکہ کرنا چاہئے۔ معمولی سی اقلیت اس سے اختلاف بھی کرتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ پاکستان کی معیشت بہت ابتر حالت میں ہے۔ اسے بہتر بنانا چاہئے۔ ملک اور قوم کی خوش حالی کی فکر کرنی چاہیے۔ یہاں لوگوں کو یہ میسر نہیں اور وہ میسر نہیں۔ پینے کا صاف پانی تک تو ہے نہیں۔ علاج معالجے کی سہولت سے لوگ محروم ہیں۔ تعلیم تک دشوار ہے لوگوں کے لئے۔ ایسے میں ایٹمی دھماکہ کرنا۔ اس کے بعد امداد بند اور ملک اقتصادی طور پر پوری طرح تباہ ---

"یہ سب کچھ تو حکومتوں نے کرنا ہی نہیں چاہا" میں نے ایک دوست کی یہ دلیل سن کر تبصرہ کیا تھا "ورنہ یہ ناممکن تو نہیں ہے۔"

"اور تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے ایٹمی دھماکا نہ کرنا کوئی جادوئی چراغ ہے کہ جس کے زور پر یہ سب کچھ ہو جائے گا" میرے ایک اور جذباتی دوست نے دھماکے کے خلاف دلیل دینے والے دوست کو منہ توڑ جواب دیا تھا۔

اور ایک ٹھنڈے دماغ والے دوست نے کہا "میاں --- ملک پہلی چیز ہے۔ خدانخواستہ وہی نہیں رہا تو کیا خوش حالی اور کیا بدحالی۔ اور کیسی محرومی اور پس ماندگی۔"

میں نے یہ سب کچھ بابا عصر کو سنایا' وہ سر ہلا کر بولے "اس وقت بھارت میں حکومت جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے' وہ بہت کٹر اور متعصب ہیں۔ یاد رکھو' ایسے لوگ بزدل بھی ہوتے ہیں۔ وہ بم گرانے میں ایک لمحے کو بھی نہیں ہچکچائیں گے۔ پاکستان کے لئے دھماکا ناگزیر ہے --- اور ہو کر رہے گا۔"

"لیکن بابا' ہمارے یہاں تو احکامات باہر سے آتے ہیں --- وہاں سے جہاں ہمیں دبا کر رکھنے کی ترکیبیں سوچی جاتی ہیں' ہماری بہتری نہیں" میں نے مایوسی سے کہا۔

"اللہ سب سے بڑا تدبیر کرنے والا ہے۔ وہ جس سے جو چاہتا ہے' کرا لیتا ہے" بابا عصر نے نہایت اطمینان سے کہا "وہ دشمنان اسلام کے دل میں مسلمانوں کی دہشت بھی بٹھا سکتا ہے۔ وہ انہیں مسلمانوں کی طرف سے بے پرواہی میں مبتلا کر کے غفلت میں بھی ڈال سکتا ہے۔ وہ ان کے دل میں یہ خیال بھی ڈال سکتا ہے کہ پاکستان کو ایٹمی دھماکے کے بعد اقتصادی پابندیوں اور قرضوں کی ادائیگی کی بلیک میلنگ کے ذریعے زیادہ آسانی سے زیر بھی کیا جا سکتا ہے" انہوں نے گہری سانس لی اور چند لمحے کے توقف کے بعد بولے "اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ پاکستان میں کوئی مرد مومن' کوئی مرد آہن ہی موجود ہو تو ملک و قوم کی ضرورت کے سامنے کسی کو بھی خاطر میں نہ لائے۔ تم فکر نہ کرو' سب ٹھیک ہو جائے گا انشاء اللہ۔"

بھارتی دھماکے کے بعد کے وہ دن عجیب تھے۔ ہر شخص مضطرب تھا۔ لیکن ایٹم کا خوف کسی کو بھی نہیں تھا۔ البتہ پاکستان کے دھماکے کی آرزو سبھی کو تھی۔ ایک عام آدمی بھی یہ بات سمجھ رہا تھا کہ بھارت کو پاکستان پر بم گرانے سے صرف ایک بات روک سکتی ہے --- پاکستان کی طرف سے جوابی ایٹم بم کا خطرہ۔ ادھر غیر ملکی ذرائع ابلاغ مسلسل خبریں دے رہے تھے کہ پاکستان پوری طرح تیار ہے اور کسی بھی وقت ایٹمی دھماکا کر سکتا ہے۔ پاکستان کے وزیر خارجہ کا بھی یہی کہنا تھا کہ ایٹمی دھماکا کر سکتا

ہے۔ پاکستان کے وزیر خارجہ کا بھی یہی کہنا تھا کہ ایٹمی دھماکا کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔

پھر ۲۸ مئی کو پوری قوم نے سکون کا سانس لیا۔ پاکستان نے ایٹمی دھماکے کر دیئے تھے۔ ملک بھر میں مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔ شکر کے نوافل ادا کیے گئے۔ قومی یکجہتی اور اتحاد کا وہ مظاہرہ دیکھنے میں آیا جو صرف ۶۵ء کی جنگ کے دوران میں دیکھا گیا تھا۔

اس روز بابا عصر سے ملاقات ہوئی۔ وہ بہت خوش تھے۔ انہوں نے چلتے چلتے چہک کر کہا ”دیکھی پاکستان کی اہمیت۔ اب تو سمجھ میں آگیا۔“

میں نے خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھا۔

”اب بتاؤ‘ عالم اسلام کے تحفظ اور اس کی قیادت کا منصب کسے ملا؟ پاکستان کو --- اب مظلوم مسلمانوں کی داد رسی پاکستان کے سوا کون کرسکتا ہے۔ کوئی کسی اسلامی ملک کو ایٹم بم کی دھمکی دے کر بلیک میل کرسکتا ہے‘ انشاء اللہ کبھی نہیں --- ہرگز نہیں ---“

”جی ہاں --- یہ تو ہے۔“

”اور اس بم کو کیا نام دیا جا رہا ہے‘ جانتے ہو؟“

”جی ہاں۔ اسلامی بم۔“

”ہاں۔ یہ بھی اسلامی بم ہے۔ کیونکہ یہ ٹیکنالوجی مسلمانوں کے پاس پہنچ گئی ہے۔ پاکستان ایک جست لگا کر دنیا کی ممتاز اقوام کی صف میں جا کھڑا ہوا ہے۔“

”لیکن بہرحال ہم پس ماندہ اور ترقی پزیر ---“

”پس ماندگی کو چھوڑو۔ بقا پہلی چیز ہے۔ جو یہ راگ گا رہے ہیں‘ انہیں گانے دو۔ جان ہے تو جہان ہے۔ پاکستان ہے تو ہم آزاد ہیں۔ ہم آزاد ہیں تو سب کچھ ہے۔ خدانخواستہ ہم غلام ہوگئے تو خوش حالی کس کام کی۔ پاکستان نظریاتی ملک ہے۔ اس کا دفاع سب سے اہم ہے۔“

”لیکن بابا --- ایٹم بم بہرحال اچھی چیز نہیں۔“

”اسے کوئی اچھا نہیں کہتا لیکن جن کے پاس یہ ہے“ وہ اسے ضائع کرنے پر تیار

نہیں ہوتے۔ یہ کیسی برائی ہے‘ جسے سب برا بھی کہتے ہیں اور سینے سے لگا کر بھی رکھتے ہیں“ بابا عصر نے جوش سے کہا ”لیکن میں اسے اچھا نہیں کہتا۔ یہ انسانیت کا قاتل بم ہے۔ اللہ نے کہا کہ بلا جواز‘ بغیر کسی قصور کے اگر ایک انسان بھی قتل کر دیا جائے تو یہ قتل انسانیت ہے۔ یہ بم تو جہاں بھی گرایا جائے گا‘ وہاں لاکھوں کروڑوں بے قصور انسان ختم ہو جائیں گے۔ خواہ بم کوئی بھی گرائے‘ کہیں بھی گرائے۔ خواہ پاکستان‘ بھارت کے کسی شہر بم گرائے‘ وہ بھی لاکھوں کروڑوں بار پوری انسانیت کو قتل کرنے کے مترادف ہوگا۔“

”لیکن بابا‘ گیہوں کے ساتھ گھن تو پستا ہی ہے۔“

”مگر یہ تو گھن کے ساتھ گیہوں پسنے والی بات ہے۔“ بابا عصر نے تیز لہجے میں کہا ”اسلام نے ہمیشہ نہتے شہریوں کو تحفظ دیا ہے۔ یہ اللہ کا حکم ہے۔ بلکہ لڑنے والے بھی ہتھیار ڈال دیں تو ان کا قتل بھی جائز نہیں۔ اور سنو‘ یہ جو بلا تفریق ختم کر دینے کی بات ہے تو یہ صرف اللہ کے قہر کو زیبا ہے۔ کسی انسان‘ کسی قوم کے لئے یہ جائز نہیں۔“

”تب تو یہ غلط ہے۔“

”میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ بم پاکستان کی ضرورت تھی۔ اس کے ذریعے پاکستان نے بھارت کو خبردار کر دیا کہ وہ جارحیت سے باز رہے۔ ورنہ اسے ایٹم بم کا جواب دے دیا جائے گا۔ اور یہ پیغام بھارت تک پہنچ گیا۔ اب بھارت انشاء اللہ یہ غلطی نہیں کرے گا اور انشاء اللہ پاکستان کو یہ بم استعمال کرنے کی ضرورت کبھی نہیں پڑے گی۔“

”اس کا مطلب ہے‘ امن قائم ہو جائے گا“ میں نے کہا۔

”بات یہ نہیں۔ دراصل میں بہت تیز چل رہا ہوں“ بابا عصر نے کہا۔ مجھے ان کی یہ بات بے ربط لگی۔ میں نے انہیں غور سے دیکھا ”ٹیکنالوجی بہت آگے چلی گئی ہے“ انہوں نے مزید کہا ”لہٰذا جنگ کے فارمولے بھی بدل گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بہترین دفاع حملہ کرنے میں ہے۔ اور یہ ایٹم بم یا ایسے ہی دوسرے بم ہلاکت خیز ہیں۔ یہ دفاع نہیں کرسکتے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ ایٹم بم ہمارا دفاع کرے گا۔ سوچو تو کسی نے

تمہارے شہر پر ایٹم بم گرا دیا اور تم نے ان کے دو شہروں پر ایٹمی حملہ کر دیا۔ یہ دفاع تو نہیں ہوا۔ تم اپنے شہروں کا دفاع تو نہیں کر سکے۔

تو اب نیا فارمولا بنے گا۔ کہا جائے گا کہ بہترین حملہ اپنا دفاع کرنے میں ہے۔ اور دفاع یہ ہے کہ جو تمہاری طرف ہلاکت بھیجے' تم وہ ہلاکت اسی کو لوٹا دو۔ اسی کی طرف بھیج دو تاکہ وہ خود اپنی بنائی ہوئی موت کا مزہ چکھے۔ دفاع یہ ہے کہ اپنی سرحدوں' زمینی' بحری اور فضائی سرحدوں کو ناقابل تسخیر بنالو۔ کوئی ہلاکت بردار چیز اس سرحد کو پار نہ کر سکے۔ اس سے ٹکرا کر اپنے ہی خالق کی طرف لوٹ جائے۔ یوں تمہارے شہری بھی محفوظ۔ اور دشمن کا بھی اپنی تباہی کے سلسلے میں تم پر کوئی دعویٰ نہیں۔ کیونکہ اس نے اپنا ہی کیا دھرا بھگتا ہوگا۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات۔ اب نئی ٹیکنالوجی کے تحت اپنا دفاعی نظام مرتب اور منظم کرنے کا وقت ہے اور انشاء اللہ یہ کام سب سے پہلے پاکستان کرے گا کیونکہ اسلام بے قصور لوگوں کو مٹانے سے روکتا ہے۔"

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟"

"جو اب ہو رہا ہے' پہلے اسے بھی ناممکن سمجھا جاتا تھا" بابا عصر نے کہا "بات اتنی سی ہے کہ کسی نے ایٹمی اسلحہ اٹھائے ہوئے ایک میزائل کو تمہاری طرف روانہ کیا۔ آنے والے رقت میں انشاء اللہ یہ بڑی بات نہیں ہوگی کہ اسے بھیجنے والے کی حد میں ہی فنا کر دیا جائے۔ یہ بھی ناممکن نہیں ہوگا کہ وہ آپ کی سرحد پار نہ کر سکے۔ بس سائنس دانوں کو اپنی سوچ کا رخ تبدیل کرنا ہوگا۔ اس کے بعد محنت اور لگن سے کام --- اور اللہ کی تائید سب ٹھیک کر دے گی۔ دیکھ لینا' انشاء اللہ سب سے پہلے یہ نظام پاکستان بنائے گا۔ اب سوچو تو' اس کے بعد کیا ہوگا۔ حملہ کرنے والا اپنے ہی خود کو ہاتھوں تباہ کر کے منہ کی کھائے گا اور جنگ ہار جائے گا اور دفاع کرنے والا بغیر ہتھیار اٹھائے بغیر لڑے جنگ جیت جائے گا۔"

"کاش ایسا ہی ہو۔"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا --- اور پاکستان میں ہوگا۔" بابا عصر نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "اور اب میں کہتا ہوں کہ اللہ نے پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنایا ہے تو تم

اسے محاورے کے طور پر لیتے ہو مگر اس وقت یہ لفظی و لغوی معنوں میں اسلام کا قلعہ ہوگا --- مسلمانوں کے مکمل تحفظ کی علامت۔"

میرا دل امید اور جوش سے بھر گیا "تو اب سب ٹھیک ہے۔"

"نہیں۔ اندر مجھے سازشی لوگ بیٹھے غیر ملکی آقاؤں کے اشارے پر جڑیں کاٹتے' سازشیں کرتے نظر آ رہے ہیں۔ وہ ملک کو قرضے کی عدم ادائیگی اور مزید قرضوں اور امداد کے عوض بیچ دینا چاہتے ہیں۔ وہ وزیراعظم سے جڑے بیٹھے ہیں۔ وہ ناکام ہوں گے انشاء اللہ۔ لیکن قوم کے مصائب ضرور بڑھا دیں گے۔ اب ہر دن ایمان کی آزمائش کا ہوگا۔ کم زور ایمان والوں کو ۹۹ تک کا عرصہ بہت سخت لگے گا۔ کہیں کہیں ایمان بیچنے کی نوبت بھی آ جائے گی۔ ہاں' ایمان والے اس سے آسانی سے گزر جائیں گے اور انشاء اللہ ۲۰۰۰ء سے سب ٹھیک ہونے لگے گا۔ اس وقت قوم کو چاہیے کہ دعا اور عمل دونوں میں کمی نہیں چھوڑے اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھے۔ ملک انشاء اللہ سلامت رہے گا لیکن افراد کے لئے خطرہ ایمان سخت ہے۔ ہر شخص کو چاہیے کہ وہ سعادت والے وقت میں مٹھی بھر اہل ایمان میں شامل ہونے کے لئے اچھے عمل کرے اور اللہ سے ڈرتا رہے۔"

مجھے جھرجھری آ گئی۔ "اے اللہ --- تو مجھ کمزور کی مدد فرما کہ میں ایمان میں کمزور ہوں" میں نے دل کی گہرائی سے دعا کی۔

"میرا اس ملک کی عورتوں کے لئے ایک پیغام ہے" بابا عصر نے کہا "وہ بھول گئی ہیں کہ اللہ نے --- اسلام نے انہیں بڑا مقام دیا ہے' بڑی اہمیت دی ہے۔ ان کے ذمے ایک بہت بڑا کام ہے۔ انہیں بیٹوں کو دودھ سے' ممتا بھری آغوش سے' اپنی محبت سے اللہ کا خوف' جذبہ جہاد' سیرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا شوق اور دین کی محبت کی نہایت طاقتور تلقین سونپنی ہے۔ انہیں بیٹیوں کو نسلوں کی تربیت کرنے کی تربیت دینی ہے۔ انہیں یاد نہیں رہا کہ وہ قوم کی اصل معمار ہیں۔ مومن اور مجاہد ماں کی گود میں بنتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ کسی قوم کا حال سمجھنے کے لئے اس کے درمیان وقت گزارنے اور مشاہدہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف اس قوم کی ماؤں کو دیکھ لو۔ ان سے تمہیں قوم کا حال معلوم ہو جائے گا۔

اور میں قوم کے جوانوں سے کہتا ہوں کہ مایوسی ذہنوں سے جھٹک دو۔ تم خوش نصیب ہو کہ تمہارے پاس بہت بڑی سعادت کے ایک عہد میں داخل ہونے کا قوی امکان موجود ہے۔ سب کچھ بھول کر خود کو اسی کے لئے تیار کرو۔ اپنے اندر جذبہ جہاد ابھارو۔ جہاد بہت آسان ہے۔ چاہو تو اپنے ہر کام کو جہاد بنالو۔ گفتگو بھی جہاد ہو سکتی ہے' تمہارا ہر قدم جہاد ہو سکتا ہے۔ جسم کی ہر حرکت جہاد ہو سکتی ہے' تمہارا ہر عمل جہاد ہو سکتا ہے۔ اگر وہ اللہ کے حکم کے مطابق ہو۔ تم ظلم سے جہاد کرو۔ جہاد کے لئے اسلحہ ضروری نہیں۔ ہر شخص اپنی جگہ رہتے ہوئے جہاد کر سکتا ہے۔ تمہارا قول و فعل' تمہارا ہر عمل اگر نفرت' تعصب' جہالت' غرض ہر برائی کے خاتمے کی نیت لئے ہوئے ہو تو نتائج سے قطع نظر تمہاری پوری زندگی کو انشاء اللہ مکمل جہاد کا درجہ حاصل ہوگا اور موت شہادت ہوگی۔ یاد رکھو' یہ دنیا اور اس کی تمام آسائشیں اور نعمتیں محض آزمائش کے لئے ہیں۔ یہاں سے تم صرف اپنے اعمال لے کر جاؤ گے' جن پر ابدی زندگی کا فیصلہ ہوگا۔ سو ابدی زندگی کی نعمتوں پر نظر رکھو اور اس کے عذاب سے --- جہنم سے ڈرتے رہو۔ تم یہاں بھی سرخرو ہوگے اور آخرت میں بھی۔"

میں بابا عصر کی رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش میں ہانپ گیا تھا۔ "آپ اتنا تیز کیوں چلتے ہیں؟" میں نے شکایتاً کہا۔

"ابھی تو مجھے اور تیز چلنا ہے۔ میرے ساتھ چلنا سیکھو" بابا عصر نے بے پروائی سے کہا "اب اشرفیوں کے سفر کا احوال سنو ---"

اس روز بابا عصر نے جو مجھے سفرنامے سنائے تھے' ان میں ایک مجھے بہت اچھا لگا۔ میرا جی چاہا کہ اسے لکھوں۔ میں اسے لکھنے کے لئے بیٹھا تو ہمیشہ کی طرح کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گیا۔ میں ایک منظر میں تھا اور وہ منظر تحرک سے بھرپور تھا۔

میں لکھنے لگا ---



کبریٰ نے سر اٹھا کر سامنے بیٹھے ہوئے نوجوان کو غور سے دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی عمر ۲۵ سال ہے۔ لیکن دیکھنے میں وہ اس سے زیادہ کا لگتا تھا اور وہ اسے بمشکل واجبی شکل و صورت کا لگتا تھا۔ وہ پڑھا لکھا بھی نہیں تھا۔ گفتگو بھی وہ سڑک چھاپ کرتا تھا۔ رہنے کو بھی اس کے پاس ایک کچا مکان تھا۔ ہاں اس کے مکان سے بہتر تھا اور اس میں سامان ضرورت بھی اس کے اپنے گھر سے زیادہ تھا۔ بس ایک اچھی بات تھی۔ وہ یہ کہ وہ برسر روزگار تھا۔ ایک ٹیکسٹائل مل میں مزدوری کرتا تھا۔ ایک لگی بندھی تنخواہ ہر مہینے گھر لاتا تھا۔

کبریٰ کی نگاہوں میں اپنی بیٹی صغریٰ کی صورت پھر گئی۔ صغریٰ کو اللہ نے ایسا حسن و جمال عطا کیا تھا کہ پیوند لگے معمولی کپڑوں میں بھی وہ بدلی سے جھانکتے چاند سے زیادہ حسین لگتی تھی مگر اس کا حسن کبریٰ کے لئے اور مصیبت بن گیا تھا۔ وہ تنہا عورت کیسے اس کی حفاظت کر سکتی تھی۔ لڑکی یتیم ہو' بے سہارا ہو اور پھر چندے آفتاب چندے ماہتاب بھی ہو تو اس سے شادی کون کرنا چاہتا ہے۔ اس کے حق میں سب بھیڑیے بن جاتے ہیں۔ بس موقع ملے اور چیر پھاڑ کر رکھ دیں۔ محض اسی وجہ سے کبریٰ نے امجد کو قبول کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ورنہ وہ کسی طرح صغریٰ کے جوڑ کا نہیں تھا۔ مگر وہ صغریٰ سے شادی کر کے اسے عزت سے رکھ تو سکتا تھا۔ یہ بہت بڑی خوبی تھی۔ پھر بھی کبریٰ تصور میں ان دونوں کو ساتھ دیکھتی تو اس کے دل پر گھونسا سا لگتا تھا لیکن وہ سوچ کر صبر کر لیتی کہ نصیب لکھنے والا جانے۔

"پھر تم نے کیا سوچا ہے چاچی؟"

کبریٰ کو امجد کی آواز نے چونکا دیا۔ اس نے پہلو بدلا پھر وہی سوال' سانپ کی طرح پھن پھیلائے آکھڑا ہوا تھا "کیا سوچوں؟ جو بس میں نہیں' اس کے لئے کیسے ہاں

کر دوں؟؟"

"سوچ لو چاچی!" امجد کے لہجے میں دھمکی تھی "دیکھو نا" میں کہتا ہوں تم مجھے کچھ نہ دو، کچھ بھی نہیں۔ پر موٹر سائیکل میری ضرورت ہے اور میں نئی بھی نہیں مانگتا، پرانی ہی لا دو۔"

"میرے بس میں ہوتا تو نئی دلا دیتی لیکن تو کہتا ہے کہ پرانی بھی تیس ہزار سے کم میں نہیں ملے گی۔"

"ہاں چاچی۔ یوں تو دس میں بھی مل جائے پر میں دیکھنے کو لئے نہیں، آنے جانے کے لئے موٹر سائیکل چاہتا ہوں۔ اس پر آؤں جاؤں گا تو پیسے بچیں گے۔ گھر میں ہی کام آئیں گے۔"

"لیکن میں تیس ہزار کہاں سے لاؤں؟"

"تو بیٹی کی شادی ایسے ہی کر دو گی؟" امجد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "شادی میں روکڑا تو چاہیے ہوتا ہے چاچی۔ جس کے پاس نہیں ہوتا وہ بھی قرض، ادھار کر لیتا ہے۔"

"مجھے کون قرض دے گا بیٹے!" کبریٰ نے لجاجت سے کہا۔

"دینے کے لئے تو سینکڑوں تیار ہوں گے، تم لینے والی تو بنو" امجد نے بے ہودگی سے کہا۔

کبریٰ کے دل پر چوٹ لگی۔ یہ بات امجد کئی بار کہہ چکا تھا۔ وہ جان بوجھ کر اسے سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر اس وقت اسے یہ سن کر غصہ آگیا۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ صغریٰ چائے لے کر آگئی۔ کبریٰ نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ بات ٹل گئی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ بات آگے بڑھی تو یہ رشتہ ہی ختم ہو جائے گا اور یہ وہ چاہتی نہیں تھی۔

صغریٰ نے چائے کی پیالی امجد کو دی جو اسے گرسنہ نگاہوں سے دیکھے جا رہا تھا۔ صغریٰ نے ماں کو چائے کی پیالی تھمائی اور جلدی سے باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

امجد نے چائے کا گھونٹ لے کر کہا "واہ بڑی گرم ہے ـــ بم ہے چاچی بم!"

کبریٰ جانتی تھی کہ امجد چائے پر تبصرہ نہیں کر رہا ہے۔ وہ اس کی نظریں پہچانتی

بھی تھی اور اسے بری بھی لگتی تھیں مگر مجبوری تھی۔ وہ اس کی آخری امید بھی تو تھا۔

"یہ صغریٰ جلد بھاگ جاتی ہے چاچی۔ اسے کہو، کبھی بیٹھا کرے میرے پاس۔ باتیں کیا کرے اور تم کبھی کبھی ادھر ادھر ٹہل جایا کرو" امجد نے بدتمیزی سے کہا۔

"صبر کر لے بیٹا۔ بس پندرہ دن کی تو بات ہے۔ پھر وہ تیری ہی ہو جائے گی" یہ کہتے کہتے کبریٰ اداس ہو گئی۔

امجد پھر اسی ٹریک پر چلا گیا "دیکھو چاچی، میں کھلی بات کرتا ہوں۔ موٹر سائیکل کے بغیر میں شادی کرنے والا نہیں۔ تم کچھ بھی کرو، مجھے تیس ہزار کر کے دو۔"

کبریٰ خاموش رہی۔ کہنے کو کچھ تھا بھی نہیں۔

امجد پیالی خالی کر کے اٹھ کھڑا ہوا "تمہارے پاس کل تک کی مہلت ہے چاچی!" اس نے کہا "سوچو اور فیصلہ کرو۔ میرے پاس ایک اچھا رشتہ ہے۔ وہ نئی موٹر سائیکل بھی دیں گے اور ٹی وی اور ٹیپ ریکارڈر بھی۔ لڑکی صغریٰ جیسی تو نہیں پر مجھے خوب صورتی کو چاٹنا ہے کیا" یہ کہہ کر وہ سلام کیے بغیر چلا گیا۔

کبریٰ وہیں بیٹھی سوچتی رہی۔ چائے ٹھنڈی ہو گئی۔ اس نے اس کا ایک گھونٹ بھی نہیں لیا تھا۔ اسے احساس بھی نہیں تھا کہ اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی ہے۔ وہ تو بس یہ سوچے جا رہی تھی کہ اس کے پاس پیٹ کاٹ کر بچائے ہوئے صرف دس ہزار روپے ہیں۔ اس نے سوچا تھا، اس میں سے کچھ برات کے کھانے میں خرچ کرے گی اور کچھ چیزیں لے آئے گی جہیز کے لئے۔ مگر یہ موٹر سائیکل!

اسے پتہ بھی نہیں چلا کہ صغریٰ اس کے پاس آ کھڑی ہوئی ہے۔ "چائے ٹھنڈی ہو گئی اماں۔ لاؤ، گرم کر لاؤں۔"

کبریٰ نے چونک کر اسے دیکھا "رہنے دے۔ میں تو پیتی ہی ٹھنڈی کر کے ہوں۔"

صغریٰ وہیں بیٹھ گئی "اماں ـــ یہ امجد بھائی مجھے اچھے نہیں لگتے" وہ آہستہ سے بولی۔

"کوئی بات نہیں، شادی ہو گی تو اچھا لگنے لگے گا۔" کبریٰ نے کہا "اور دیکھ،

شکل صورت اللہ بناتا ہے' اسے نہ برا کہتے ہیں' نہ سمجھتے ہیں۔"

"میں شکل صورت کو نہیں کہتی اماں۔ وہ مجھے بہت خراب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اور اماں' میں بتا دوں وہ اچھے آدمی نہیں ہیں۔"

کبریٰ نے اسے بہت غور سے دیکھا "وہ جیسا بھی ہے' ہماری آخری امید ہے۔ شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اماں' تم مجھے بوجھ سمجھ کر مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہو" صغریٰ نے شکایتاً کہا "اب میں میٹرک کر چکی ہوں۔ بوجھ نہیں ہوں' نوکری کر سکتی ہوں۔"

"میں تجھے کبھی نوکری نہیں کرنے دوں گی۔ تجھے نہیں پتہ' یہ دنیا بہت بری ہے ------ خاص طور پر خوب صورت لڑکیوں کے لئے۔ اور یہ بھی نہیں کہ تو میرے لئے بوجھ ہے۔ بس شادی ضروری ہے۔ کسی کا نام جڑ جائے تو مضبوطی آجاتی ہے۔ ایک سہارا مل جاتا ہے۔ اس کے بغیر لڑکی کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہوتی ہے' جسے لوٹنے کے لئے سب دوڑ پڑتے ہیں۔"

"لیکن اماں' تم نے بھی تو بے سہارے زندگی گزار دی۔ خود کو بھی سنبھال کر رکھا اور مجھے بھی۔"

"اللہ کا آسرا تھا بیٹی۔ ورنہ جیسے گزری ہے' میرا دل ہی جانتا ہے" کبریٰ نے آہ بھر کے کہا "یہ دنیا بھوکے بھیڑیوں سے بھری پڑی ہے اور ایسے بھی ہیں جو روپ بدل کر آتے ہیں۔ میں تو پل صراط سے گزری ہوں بیٹی۔ تجھے اس سے نہیں گزارنا چاہتی" پھر کبریٰ نے بیٹی کو اپنے چند ایسے واقعات سنائے' جو اس نے کسی کو نہیں سنائے تھے اور وہ صغریٰ کو تو مر کر بھی نہ سناتی مگر وہ اسے احساس دلانا چاہتی تھی کہ امجد جیسا بھی ہے' اس کے لئے سائبان ہوگا۔ اس نے امجد کے لئے صغریٰ کی ناپسندیدگی بھانپ لی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ بیٹی ازدواجی زندگی کا آغاز اس ناپسندیدگی کو ساتھ لے کر کرے۔ ایسے میں ساری زندگی روتے روتے ناخوش ہی گزر جاتی ہے۔ وہ بیٹی کو سمجھوتوں کی اہمیت کا احساس دلانا چاہتی تھی۔ یہ سمجھانا چاہتی تھی کہ زندگی میں سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں اور وہ ہنسی خوشی کر لئے جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔

اس کا نتیجہ مثبت نکلا۔ صغریٰ سہم گئی کہ دنیا میں یہ بھی ہوتا ہے۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر کبریٰ نے سکون کی سانس لی۔ اسے یقین تھا کہ اب اس کی بیٹی امجد کو اپنا پسندیدہ مرد مان لے گی۔ اس کے سپنے دیکھنے لگی گی۔ اس کی آنکھوں میں تو ابھی سے ہی سپنوں کے رنگ نظر آنے لگے تھے۔

مگر خود کبریٰ کے تصور میں موٹر سائیکل در آئی جو وہ امجد کو لے کر نہیں دے سکتی تھی۔ مگر امجد نے اس کی شرط لگا دی تھی۔

صغریٰ نے جو ماں کا رنگ بدلتے دیکھا تو پریشان ہوگئی "کیا ہوگیا اماں؟"

کبریٰ نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ سن کر صغریٰ پریشان ہوئی۔ کبریٰ نے سمجھ لیا کہ اس کا اندازہ درست تھا۔ بیٹی نے اپنی سوچ بدل لی ہے اور ذہنی طور پر امجد کو قبول کر لیا ہے۔ اسے افسوس ہوا کہ تبدیلی کے ساتھ ہی اسے عدم تحفظ کا احساس بھی ملا۔

"تو اب کیا ہوگا اماں؟" صغریٰ کے لہجے میں خوف تھا۔ ماں کے سنائے ہوئے واقعات نے اسے ڈرا دیا تھا۔ اب وہ بے سہارا نہیں رہنا چاہتی تھی۔

"اللہ مسبب الاسباب ہے۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔" کبریٰ نے اسے دلاسا دیا۔

"اور جو نہ ہوا تو؟"

"ایک بات کہوں" کبریٰ نے بیٹی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "تو اکھڑی اکھڑی رہتی ہے۔ امجد کے سامنے بھی کم ہی آتی ہے۔ ذرا خود کو بدل کے تو دیکھ۔ اس کے پاس بیٹھ۔ محبت سے بات کر۔ پیار سے سمجھا تو وہ مان بھی جائے گا۔ تیری بات تو کوئی مرد ٹال ہی نہیں سکتا۔ اتنی پیاری ہے تو" یہ کہتے کہتے کبریٰ کو بے غیرتی کا احساس ستانے لگا۔ امجد کی نظربازی سے وہ بے خبر تو نہیں تھی۔ لیکن اس نے اس احساس کو دبا لیا۔ اس پر ضرورت اور مصلحت کا پردہ ڈال دیا۔

"اچھا اماں' کوشش کروں گی" صغریٰ نے آہستہ سے کہا۔ اب وہ اس بات کی اہمیت کو سمجھ گئی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب امجد کو نظرانداز نہیں کرے گی۔

"شاباش بیٹی!" کبریٰ نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ذرا دیر بعد صغریٰ نے کہا "اماں ---- کاکا کے ہاں سے مونگ کی دال لے آؤ ---- چینی بھی ختم ہونے والی ہے۔"

"اچھا بیٹی!"



وہ محلے کی چھوٹی سی دکان تھی۔ کاکا زبان کا میٹھا اور دل کا اس سے بھی اچھا تھا۔ تمام وقت دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کرنے کی کوشش میں گھلتا رہتا تھا۔ اور دکھ درد بہت تھے۔ اس لئے کہ اس کی دکان اس محلے کا ---- اس کے اپنے گھر کا ایک حصہ تھی۔ محلے کے دکھ درد سے کون بے خبر رہ سکتا ہے۔

دکان کافی چلتی تھی۔ اللہ کی رحمت تھی اس پر۔ دوسرے محلوں کے لوگ بھی اس کے پاس سودا لینے آتے تھے۔ کچھ اس میں اس کی نیکی اور ایمانداری کا بھی دخل تھا۔ وہ تول کا سچا تھا۔ کبھی ڈنڈی نہیں مارتا تھا۔ پھر اس دور میں بھی وہ سچ مچ آٹے میں نمک کے برابر منافع لیتا تھا اور نمک وہ ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے بہت کم کھاتا تھا۔ اس لئے اس کا منافع اور کم ہو جاتا تھا۔ اور یہ بھی کہ آدمی کے اپنے دکھ درد کم نہیں ہوتے۔ ایسے میں وہ دوسروں کے دکھ اور تکلیفیں بھی محسوس کرنے لگے تو بلڈ پریشر تو ہائی ہوتا ہی ہے۔ مختصر یہ کہ علاقے میں وہ ایسی دکان تھی' جہاں ہر چیز دوسری دکانوں سے سستی ملتی تھی' ایسے میں دکان داری تو بڑھتی ہی ہے۔

لیکن اتنی دکان داری کے باوجود کاکا کا ہاتھ تنگ ہی رہتا تھا۔ یہ درست ہے کہ وہ ہر ایک کو ادھار نہیں دیتا تھا' مگر جن کے حالات سے وہ واقف تھا' ان سے تو انکار نہیں کرسکتا تھا۔ اور آڑا وقت تو کسی پر بھی آسکتا ہے۔ ایسے لوگوں کو بھی وہ منع نہیں کرسکتا تھا۔ اس پر ستم یہ کہ اسے قرض وصول کرنا نہیں آتا تھا۔ اس کے لئے تو یاد دہانی بھی آسان نہیں تھی' اصرار تو وہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ بے مروتی اس کی فطرت میں تھی ہی نہیں۔

کاکا خوش قسمت بھی تھا۔ اللہ نے اسے تین سعادت مند بیٹے دیئے تھے اور وہ

تینوں برسر روزگار تھے۔ پھر کاکا طبعاً درویش تھا۔ اس کا اپنا کوئی خرچ تھا ہی نہیں۔ چائے' پان سگریٹ سے وہ بے نیاز تھا۔ تین وقت کی روٹی گھر سے مل جاتی تھی۔ کپڑوں سے اسے غرض نہیں تھی۔ عید' بقر عید پر بیٹے زبردستی کپڑے بنا دیتے تھے۔ ورنہ اسے اس کی بھی پرواہ نہیں تھی۔ اس کے باوجود اکثر مہینے میں ایک دو بار اسے بیٹوں سے مدد لینی پڑ جاتی تھی۔ وجہ سادی ہی تھی۔ آٹے میں ہائی بلڈ پریشر کے مریض کی ضرورت جتنے نمک کا منافع تو ادھار کھانے والوں کی نذر ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اصل رقم کا کچھ حصہ بھی ہر ماہ پھنس جاتا تھا اور جن سے وہ ہول سیل پر مال لیتا تھا' وہ ایک خاص مدت بعد تقاضا کرنے لگتے تھے۔ ان کا حساب صاف نہ کرتا تو مال ملنا بند ہو جاتا۔ ایسے میں بیٹے ہی اس کی مدد کرتے۔ وہ نہ ہوتے تو دکان بہت پہلے بند ہو چکی ہوتی۔

کاکا ایک ایسا خوش نصیب انسان تھا' جس کی اپنی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ مگر وہ دوسروں سے زیادہ پریشان رہتا تھا۔ وہ دوسروں کی پریشانیوں کا خیال کرکے بھی پریشان ہوتا اور پھر انہیں ادھار دے کر خود بھی پریشان ہو جاتا۔

اس وقت بھی کاکا پریشان تھا۔ صابن کی گاڑی والا کہہ کر گیا تھا کہ کل اسے ہر حال میں پیسے چاہئیں۔ گویا اب پھر کسی بیٹے سے مدد مانگنی تھی۔

اچانک اسے کبریٰ دکان کی طرف آتی دکھائی دی۔ کبریٰ پر اسے بڑا پیار آتا تھا۔ بیس سال کی عمر میں وہ بیوہ بھی ہوئی اور بیٹی کی ماں بھی بنی۔ اور اب اس کی بیٹی بھی بیس سال کی ہوگئی تھی۔ کاکا نے کبریٰ کا حسن و جمال بھی دیکھا تھا۔ وہ لاکھوں میں نہیں' کروڑوں میں ایک تھی۔ اس حسن پر مستزاد بھری جوانی۔ ایسے میں بیوگی کے بیس بے داغ سال گزارنا بہت بڑا جہاد تھا جو کبریٰ نے کیا تھا۔ کیسی کیسی آزمائشوں سے گزری تھی وہ۔ کیسی کیسی ترغیب سے بچی تھی' کاکا خود اس کا گواہ تھا۔ وہ تو اب بھی ایسی تھی کہ مرد اسے دیکھ کر آہیں بھرنے لگیں۔ مگر اس نے خود کو پتھر کرلیا تھا۔ اسی لئے کاکا پیار سے زیادہ اس کا احترام کرتا تھا۔

کبریٰ نے آکر اسے سلام کیا اور بولی "کاکا ---- آدھا کلو مونگ کی دال دے دو۔"

کاکا دال تولنے لگا "بیٹی --- صابن بھی لے جا پھر پتہ نہیں' دکان پر رہے نہ رہے" وہ بولا۔ اسے پریشانی تھی کہ وہ کل صابن والے کو پیسے نہیں دے سکے گا۔

کبریٰ بھی ناتجربہ کار نہیں تھی۔ اس بات کا مطلب سمجھتی تھی۔ "کاکا --- میرا حساب تو کافی لمبا ہوگا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں --- کچھ ایسا زیادہ بھی نہیں" کاکا نے جلدی سے کہا۔

"پھر بھی بتا تو دو۔"

"سات سو سے کم ہی ہے" کاکا نے کہا پھر پوچھا "صغریٰ کی شادی کب کر رہی ہے تو؟"

"عید کے دسویں دن کا ارادہ ہے۔ دعا کرو کاکا' اللہ نصیب اچھے کرے میری بچی کے۔"

"دعا تو کرتا ہی ہوں' فکر بھی کرتا ہوں بیٹی۔ دیکھ کوئی ضرورت ہو تو تکلف نہ کرنا' سب سے پہلے مجھے بتانا۔"

کبریٰ شرمندہ ہوئی --- اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے "تم اتنے اچھے ہو کاکا۔ اور میں اتنی بری ہوں کہ پیسے ہوتے ہوئے بھی تمہارا حساب صاف نہیں کر رہی ہوں۔"

"تو میں نے تجھ سے تقاضا تو نہیں کیا" کاکا بولا "کیا میں سمجھتا نہیں ہوں' شادی کے گھر میں تو لاکھ بھی ہو تو کم ہے۔ لے یہ صابن بھی لے جا۔"

کبریٰ کاکا کی دکان سے اپنے گھر تک روتی ہوئی آئی ---

افطار کا وقت قریب تھا۔ صغریٰ پریشان تھی کہ اماں ابھی تک پھل لے کر نہیں آئی۔ پھر اسے امجد کا خیال آیا اور اس کا دل عجیب طرح دھڑکنے لگا۔ واجبی سے بھی کم شکل صورت کا امجد اس کے لئے ایک خاص اہمیت اختیار کرگیا تھا۔ اور یہ سوچ کر اس کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہونے لگیں کہ آج وہ اس کے قریب بیٹھے گی۔

دروازہ کھلنے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اماں کے چہرے پر ایسی خوشی اور آنکھوں میں ایسی چمک اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس نے غور سے اماں کے ہاتھوں کو دیکھا اور مایوس ہوگئی۔ اماں پھل نہیں لائی تھی۔

مگر اس کی مٹھی بند تھی "اماں --- پھل نہیں لائیں؟"

"لوٹ پڑی ہوئی ہے بیٹی۔ پھل بہت مہنگا ہے۔ چھوڑ --- ہم پکوڑوں سے افطار کرلیں گے۔"

صغریٰ نے مزید شکوہ نہیں کیا۔ اس سب کی وہ بچپن سے عادی تھی۔ پتہ نہیں کیوں' جو چیز بھی اچھی لگے' وہ مہنگی ہی ہوتی ہے۔ اس نے سوچا' مگر فوراً ہی اس سوچ کو جھٹک دیا "پر اماں' پھل مہنگے ہونے پر تم اتنی خوش کیوں ہو" اس نے پوچھا۔

"یہ بات نہیں پگلی!" کبریٰ نے کہا اور بند مٹھی اس کے سامنے کھول دی۔

صغریٰ سانس لینا بھی بھول گئی۔ وہ مبہوت ہو کر ان اشرفیوں کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے جھپٹ کر ماں کی ہتھیلی پر سے انہیں اٹھایا اور بولی "اللہ --- کتنی حسین ہیں۔ یہ کیا چیز ہے اماں؟"

"ظاہر میں تو اشرفیاں ہیں لیکن اصل میں اللہ کی رحمت اور خیر و برکت ہیں۔ ہم بے حیثیت لوگوں کو عزت اور اعتبار ملا ہے ان سے۔"

صغریٰ انہیں الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ اشرفیوں پر ایک طرف اللہ اور دوسری طرف کلمہ لکھا تھا "یہ تو بہت --- بہت زیادہ قیمتی ہیں اماں!" وہ بولی۔ چند لمحے وہ سوچتی رہی پھر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں "اماں --- ان کے بندے بن جائیں تو مجھ پر کیسے لگیں گے؟"

"نہیں بیٹی۔ ایسا سوچنا بھی نہیں" کبریٰ نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا "یہ تو امانت ہیں۔"

"تمہیں ملیں کہاں سے؟"

"میں بازار سے آرہی تھی کہ ایک شخص نے مجھے روک کر یہ تھما دیں اور بولا ---" کبریٰ اس شخص کی باتیں من و عن دہراتی رہی۔ صغریٰ کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی گئیں۔

"میری سمجھ میں تو نہیں آتی یہ بات" کبریٰ کے خاموش ہونے پر صغریٰ نے کہا "پاکستان کی خوش حالی اور استحکام سے ان کا کیا واسطہ ---؟"

"اللہ کی باتیں ایسی آسانی سے کب سمجھ میں آتی ہیں۔ اپنے بھید وہی جانے۔

میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ قرآن پاک ہدایت نامہ ہے۔ کروڑوں انسان اسے پڑھتے ہیں لیکن سمجھ میں کتنوں کی آتا ہے۔ یہ بات سمجھنے کی نہیں' بس ماننے اور عمل کرنے کی ہے۔"

"لیکن اماں' یہ بہت قیمتی ہیں۔ موٹر سائیکل کا مسئلہ بھی حل ہو سکتا ہے۔ بہت سارے پیسے مل سکتے ہیں ہمیں۔"

"جہنم میں گئی موٹر سائیکل۔" کبریٰ کو طرارہ آگیا "ان کے بارے میں تو سوچنا بھی نہیں۔"

صغریٰ نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔ اس نے کبھی اس سے اتنی سختی سے بات نہیں کی تھی "اتنا ناراض کیوں ہو رہی ہو اماں۔ میں دونوں کے لئے تو نہیں کہہ رہی ہوں مگر دینے والے نے کہا تھا کہ تم چاہو تو ان میں سے ایک رکھ سکتی ہو اور اس ایک سے ہمارے سب دلدر دور ہو سکتے ہیں۔"

"مگر میں یہ بھی نہیں رکھوں گی۔ جسے دوں گی' دونوں ہی دوں گی۔ اس کا ایمان کیوں خطرے میں ڈالوں۔"

"یہ تو زبردستی کی بات ہے اماں!" صغریٰ نے منہ پھلا کر کہا۔

"دیکھ بیٹی۔ دینے والے نے مجھ سے کہا' چاہو تو ایک تم رکھ لینا۔ وہ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ ایک تمہاری ہے۔ مگر اس نے نہیں کہا۔ کہتا تو میں رکھ لیتی۔ لیکن اس نے مجھے بس اختیار دیا ---- چاہو تو ----"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"دیکھ ۔ اسے بھی کسی نے یہی کہہ کر دونوں اشرفیاں دی ہوں گی۔ اس بھلے آدمی نے بھی ایک اپنے لئے نہیں رکھی۔ دونوں میری طرف بڑھا دیں اور یہ سلسلہ نہ جانے کہاں سے یونہی چلا آرہا ہوگا۔ میں کیوں اس کے خلاف کروں؟"

"میری سمجھ میں نہیں آتی یہ بات۔ ہم اتنے غریب ہیں ----"

"لیکن اللہ کا شکر ہے کہ عزت سے جی رہے ہیں۔ کبھی ایک وقت کا فاقہ بھی نہیں ہوا" کبریٰ نے تیز لہجے میں کہا پھر نرمی سے بیٹی کو سمجھایا "بیٹی پاکستان ہے تو سب کچھ ہے۔ پاکستان کا فائدہ ہم سب کا فائدہ۔ اس کی خوش حالی ہماری خوش حالی۔

اس کی برکت ہماری برکت۔ ہم لالچ میں پڑ کر اپنے چھوٹے سے فائدے کے لئے پاکستان کا بڑا نقصان کیوں کریں جو کروڑوں پاکستانیوں کا نقصان ہوگا۔ پھر دینے والے نے کہا کہ یہ اپنی منزل پر پہنچ کر دین اسلام کی سربلندی لائیں گی۔ تو میں دین کا کام بھی خراب کروں۔ تو غور سے اللہ کا نام اور یہ کلمہ دیکھ۔ یہ حرف تجھے کچھ کہتے محسوس نہیں ہوتے۔ مجھ سے تو یہ صاف کہہ رہے تھے ---- تم کمزور نہ پڑنا کبریٰ ---- ورنہ بہت نقصان ہوگا۔"

صغریٰ کچھ کچھ قائل ہوگئی تھی۔ اس نے اللہ کے نام اور کلمے کو غور سے دیکھا۔ انہوں نے اس سے کچھ کہا تو نہیں لیکن انہیں نظریں جما کر دیکھتے ہوئے نہ جانے کیوں اس کا دل بھر آیا۔ پوری طرح قائل نہ ہونے کے باوجود اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو اماں!" یہ کہہ کر اس نے اشرفیاں ماں کو دے دیں۔

اس لمحے مغرب کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔ افطار کا وقت ہوگیا تھا۔

دونوں ماں بیٹی کمرے میں تھیں۔ کبریٰ نے کہا "بیٹی' امجد آئے تو اس کے پاس بیٹھ کر طریقے سے اسے سمجھانے کی کوشش کرنا۔ تو ہی اسے سمجھا سکتی ہے۔ میرا پوچھے تو کہہ دینا نماز پڑھ رہی ہیں۔"

اس لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ صغریٰ لپک کر گئی۔ کبریٰ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کی سانسیں بھی دعا بن گئیں۔

صغریٰ نے امجد کو صحن میں چارپائی پر بٹھایا اور خود ذرا فاصلے سے بیٹھ گئی "اماں تو نماز پڑھ رہی ہیں" وہ بولی۔

امجد بڑی خباثت سے مسکرایا "آج پہلی بار میں صحیح وقت پر آیا ہوں۔" پھر اس نے بہت غور سے صغریٰ کو دیکھا اور شک آمیز لہجے میں بولا "پہلے تو' تو جھلکی بھی نہیں مارتی تھی۔ آج بڑی مہربانی ہو رہی ہے' خیر تو ہے؟"

"اماں ہوتی تھیں نا اور مجھے شرم بھی آتی ہے۔"

امجد اسے غور سے دیکھتا رہا "ویسے تو ہے بڑی بم چیز۔ میں کیا ہوں' تجھے دیکھ کر تو فرشتوں کے دل بے ایمان ہو جائیں۔"

صغریٰ کو وہ تعریف بہت بری لگی مگر اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ وہ سمجھوتا کرنا سیکھ رہی تھی۔

"ذرا قریب تو آ۔ اتنی دور کیوں بیٹھی ہے؟" امجد نے فرمائش کی۔

صغریٰ کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن پھر بھی وہ اس کے قریب ہوگئی۔

امجد نے صغریٰ کا ہاتھ تھام لیا اور دوسرے ہاتھ سے اسے سہلانے لگا۔ صغریٰ کو وہ لمس بہت برا لگا لیکن اسے ڈر تھا کہ وہ کچھ کہے گی تو امجد ناراض ہو جائے گا اور اماں کا کہنا تھا کہ وہ ان کی آخری امید ہے۔ وہ اسے کھونا نہیں چاہتی تھی بلکہ اسے تو اس کو موٹر سائیکل سے دستبردار ہونے پر رضا مند کرنا تھا۔

ادھر کمرے میں کبریٰ ان کی آوازوں پر کان لگائے تھی۔ اس کی دروازے پر آکر انہیں دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ پھر بھی وہ اٹھی اور دروازے کی طرف چل دی۔

صغریٰ اپنے خیالوں سے چونکی۔ امجد کا ہاتھ حرکت کرتے کرتے اس کے ہاتھ سے گزر کر بازو تک پہنچ چکا تھا اور اب کندھے پر پہنچنے والا تھا۔ وہ پوری جان سے لرز گئی۔ "یہ --- یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟"

اتنی دیر میں امجد اس کے کندھے پکڑ چکا تھا۔ اس نے کھینچ کر صغریٰ کو سینے سے لگانے کی کوشش کی "کیوں --- تم پر میرا اتنا حق بھی نہیں" اس نے بدمعاشی سے کہا۔

"شادی سے پہلے تو یہ حق نہیں ہوتا" صغریٰ نے نرم لہجے میں کہا۔ وہ اسے خود سے دور رکھنے کی کوشش کر رہی تھی "بے صبرے نہ بنو۔"

"میں اس لئے بے صبرا بن رہا ہوں کہ شادی کا اب کوئی امکان نہیں ہے۔ میں بچہ نہیں ہوں، سب سمجھتا ہوں۔ چاچی نے تجھے اس لئے میرے پاس بھیجا ہے ناکہ تو مجھے لبھا کر موٹر سائیکل کا خیال دل سے نکالنے پر راضی کرے۔ پر ایسا ہوگا نہیں۔ میں موٹر سائیکل کے بغیر نہیں مانوں گا" اور امجد کے جبر میں اور شدت آگئی۔

کبریٰ نے دروازے سے یہ سب دیکھا اور تڑپ کر باہر نکل آئی "بیٹی --- تو جاکر چائے بنا" اس نے نرم لہجے میں صغریٰ سے کہا۔ صغریٰ کے جانے کے بعد وہ امجد کے سامنے بیٹھ گئی "تو ضد چھوڑ دے امجد۔ دیکھ، وہ میرے بس کی بات نہیں۔ میں

تیری ضد کیسے پوری کروں؟"

"یہ ضد میں نہیں چھوڑوں گا کیونکہ تم پوری کر سکتی ہو۔"

"کیسے؟ میں سچ کہہ رہی ہوں ---"

"وہ رمضان تم پر مرتا ہے۔ تمہاری ہر شرط پوری کرنے کے لئے تیار ہے۔ تم اس سے شادی کرلو۔ صغریٰ کے جانے کے بعد اکیلی بھی نہیں رہو گی اور مجھے بھی موٹر سائیکل مل جائے گی۔"

"وہ اڈا چلانے والا رمضان ---؟" کبریٰ نے حقارت سے کہا۔

"وہ اس کا کاروبار ہے اور شادی کوئی بری بات نہیں۔"

"لعنت ہو ایسے کاروبار پر --- اور ایسی شادی پر۔ پہلے جو تین کی تھیں۔ اس نے ان کا کیا ہوا۔ انہیں بھی کاروبار میں جھونک دیا بدبخت نے۔ میں اس سے شادی کرلوں۔"

"نہ کرو۔ تمہاری مرضی، کرلو تو دھن میں کھیلوگی۔ نہیں کرو گی تو بیٹی کا بوجھ بھی لئے بیٹھی رہو گی۔"

"مجھے شادی کرنی ہوتی تو پہلے ہی کرلیتی جب جوان بھی تھی اور خوب صورت بھی" کبریٰ نے تلخ لہجے میں کہا۔

"جوان تو تم اب بھی ہو --- اور خوب صورتی میں تو صغریٰ سے بھی آگے ہو چاچی" امجد نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے ایسے بات مت کر۔ دیکھ مان جا، میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں" کبریٰ کو خیال ہی نہیں رہا کہ اشرفیاں اس کی مٹھی میں دبی ہیں۔ اشرفیاں نیچے گریں۔ اس نے جھپٹ کر انہیں اٹھالیا لیکن امجد انہیں دیکھ چکا تھا۔ "یہ --- یہ کیا ہیں؟"

کبریٰ کو کہانی پھر دہرانی پڑی "یہ تو بیڑا پار کرسکتی ہیں اپنا" امجد نے خوش ہوکر کہا۔

"یہ امانت ہیں، میری نہیں" کبریٰ نے اسے سمجھایا لیکن اسے سمجھانا صغریٰ کے مقابلے میں بہت بڑا کام تھا اور ناممکن بھی --- وہ بھی دلیل دے رہا تھا کہ ایک تو اس کی اپنی ہے اور وہ اسے قائل بھی نہیں کرسکتی تھی۔

"اس کے زور پر تو مجھے کار بھی دلا سکتی ہو چاچی!"

"میں نے کہا نا' یہ میری نہیں۔"

امجد نے مسئلے کا آسان حل ڈھونڈ نکالا "چلو --- ایسا کرو چاچی۔ یہ مجھے دے دو۔ پھر میں کبھی بھی نہیں مانگوں گا اور صغریٰ سے شادی بھی کرلوں گا۔"

"یہ میں تمہیں نہیں دے سکتی۔"

"کیوں نہیں دے سکتیں" امجد نے حیرت سے کہا "تمہیں آگے تو بڑھانی ہی ہیں۔ مجھے دے دو۔ تمہیں موٹر سائیکل کے فکر سے نجات بھی مل جائے گی اور بیٹی کی شادی بھی ہو جائے گی۔"

"یہ کسی نیک اور ایمان دار آدمی کو دینی ہیں۔"

"تمہارے داماد سے بڑھ کر نیک اور ایمان دار کون ہوگا" امجد کے لہجے میں دھمکی تھی۔

"نہیں۔ یہ میں تجھے نہیں دے سکتی ------ نہ ہی دوں گی" کبریٰ کے لہجے میں جانے کیسے قطعیت آگئی۔

امجد اٹھ کھڑا ہوا "بس تو شادی کی بات ختم سمجھو۔"

"ٹھیک ہے' اللہ کی مرضی!" کبریٰ نے آہ بھر کر کہا اور آسمان کو تکنے لگی۔

جاتا ہوا امجد دروازے پر رکا "تم مجھے موٹر سائیکل دے سکتی تھیں۔ ایک اور بھی صورت تھی تمہاری شادی کے سوا" اس نے زہریلے لہجے میں کہا "صغریٰ کو تو صرف ایک رات میں نئی موٹر سائیکل بھی مل سکتی تھی اور میں اسے پھر بھی قبول کر لیتا۔ ایک رات سے فرق کیا پڑتا ہے۔"

کبریٰ کا ضبط جواب دے گیا "چلا جا بے غیرت!" وہ چلائی۔

"جا رہا ہوں مگر حسین بیٹی وبال بنے گی' عزت لٹنے لگی تو میں تمہیں یاد آؤں گا" یہ کہہ کر امجد چلا گیا۔

کچن کے دروازے پر کھڑی صغریٰ کے دل میں اس کی آخری بات کھب گئی۔ وہ وبال بنے گی --- اس کی عزت لٹے گی! یہ اماں نے کیا' کیا؟

وہ بڑی سوگوار رات تھی!

دونوں ایک پل کے لئے بھی نہ سو سکیں۔ اپنے اپنے پلنگ پر کروٹیں بدلتی رہیں۔ مگر انہوں نے ایک دوسرے سے بات نہیں کی۔ بیٹی کو حجاب روکتا تھا اور ماں کے پاس کہنے کے لئے کچھ تھا ہی نہیں۔

لیکن سحری کے بعد صغریٰ سے نہ رہا گیا "اماں' تم نے برا کیا" اس نے آہستہ سے کہا "اشرفیاں انہیں دے دیتیں۔"

"ایسے ذلیل' نیچ بدکار کے ہاتھ میں وہ پاک امانت دے دیتی" کبریٰ بھڑک گئی۔

"وہ بے ایمان ہوتے تو اشرفیاں تمہارے پاس واپس آجاتیں' نقصان کیا تھا اس میں۔"

"جانتے بوجھتے غلط آدمی کو امانت سونپنے کی گناہ گار بن جاتی۔ اپنی غرض کیلئے وہ ایک بے ایمان آدمی کو دے دیتی۔ یہ سوچ کر انہیں واپس تو آنا ہی ہے تو یہ بے ایمانی نہیں ہوتی۔ میں خود بھی بے ایمان ہو جاتی۔ سعادت سے محروم ہو جاتی۔ پھر تو وہ اشرفیاں میرے پاس بھی نہیں ٹھہرتیں۔"

"لیکن اماں' اب کیا ہوگا؟"

"تو فکر نہ کر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کیا ٹھیک ہو جائے گا اماں۔ تمہی تو کہتی تھیں کہ وہ ہماری آخری امید ہے۔"

"غلط کہتی تھی میں۔ امید تو بس اللہ سے رکھنی چاہیے۔ اسی کے سہارے تو بیوگی کے بیس سال گزارے ہیں میں نے۔"

"مگر اماں' میرا کیا ہوگا۔ تم نے تو ڈرا دیا ہے مجھے۔"

"سب بھول جا۔ آدمی آدمی سے لو لگائے گا تو ڈرے گا ہی۔ اللہ سے لو لگائے تو کوئی ڈر نہیں رہتا۔ میں تو نڈر ہوگئی' تو بھی ہو جا۔ وہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔"

"لیکن اماں' امجد بھائی مجھے تحفظ دے سکتے تھے۔"

"وہ صرف رب دے سکتا ہے اور اس لفنگے کو بھائی نہ کہنا کبھی۔ یاد نہیں' اس بے غیرت نے کیا کہا تھا۔"

صغریٰ کو یاد آیا تو اس کا دل برا ہوگیا۔ امجد واقعی بے غیرت تھا۔ وہ تو بعد میں بھی اسے بیچتا رہتا۔ اچھا تو وہ صغریٰ کو لگتا ہی نہیں تھا۔ مگر اب تو اس سے نفرت

محسوس ہونے لگی "ٹھیک ہے اماں' وہ واقعی برا تھا --- لیکن ---"

"سن --- جو ہونا ہے' ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ تو بھی میری طرح کی زندگی گزارے گی۔ پر زندگی تو گزر ہی جاتی ہے بیٹی۔ نہ گھبرا۔ آخرت میں بڑا اجر ملے گا انشاء اللہ۔"

اور نہ جانے کیسے صغریٰ کو قرار آگیا۔ چند لمحے بعد اس نے پوچھا "اور اشرفیوں کا کیا کروں گی اماں؟"

"ان کا بھی سوچ لیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔"



کاکا نے اشرفیوں کو عقیدت سے دیکھا' چوما اور آنکھوں سے لگایا۔ کبریٰ کی پوری بات سننے کے بعد کہا "تجھے اللہ نے بڑائی دی ہے بیٹی۔ تو فکر نہ کر۔ میں انہیں ایک ایسے شخص کو سونپوں گا کہ ان کے تو انشاء اللہ پر لگ جائیں گے۔ بہت تیز سفر کریں گی۔"

"شکریہ کاکا۔ تم نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا۔"

"شکریہ کیسا بیٹی۔ تو نے اپنا فرض پورا کیا۔ میں اپنا کروں گا" کاکا کہتے کہتے رکا اور پھر جھجک جھجک کر بولا "ایک بات کہوں۔ برا تو نہیں مانے گی؟ تو میرے ادھار کو اب بھول ہی جا۔"

"نہیں کاکا۔ تم مجھے اس کا صلہ دے رہے ہو۔"

"یہ بات نہیں ہے۔ تو نے مجھے سعادت دلوا کر احسان کیا ہے۔"

"کیسا احسان کاکا!" کبریٰ نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "یہ تو اللہ کی دین ہے --- میرے لئے بھی اور تمہارے لئے بھی" پھر اس نے پلو سے کھول کر ہزار کا نوٹ کاکا کی طرف بڑھایا "پچھلا حساب صاف کرکے باقی پیشگی رکھ لو" کاکا کی آنکھوں میں حیرت دیکھ کر اس نے وضاحت کی "کہا تھا نا کہ پیسے ہوتے ہوئے نہیں دے رہی ہوں۔ دس ہزار روپے صغریٰ کی شادی کے لئے رکھے تھے۔"

"تو ---؟"

"اللہ کا حکم نہیں ہے تو پھر قرض کیوں نہ اتار دوں۔ جب وہ چاہے گا' بہتری کر دے گا" یہ کہہ کر کبریٰ تیزی سے چل دی۔ ورنہ مزید وضاحت کرنی پڑتی۔ وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ ایک عجیب سی بے فکری اس پر طاری ہوگئی تھی اور اپنا آپ بہت اچھا لگ رہا تھا۔

چلتے چلتے اس کے ذہن میں عجیب سوچ ابھری اور اس نے فیصلہ بھی کرلیا۔ آج وہ مرغی پکوائے گی۔ پھل خریدے گی' چاہے کتنے ہی مہنگے ہوں۔ صغریٰ خوش ہوگی اور یہی نہیں' وہ عید کی خریداری بھی ڈھنگ سے کرے گی۔ عید کے دن بھی اچھا کھانا پکے گا اس کے گھر میں---

عید کے روز پڑوسن رشیدہ ملنے آئی۔ وہ رشتے کراتی تھی۔ باتوں باتوں میں اس نے کبریٰ سے پوچھا "صغریٰ کو کب نمٹا رہی ہو' عید کے دسویں دن نا ---؟"

"نہیں۔ وہ بات ہی ختم ہوگئی" کبریٰ نے کہا لیکن رشیدہ کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ مچلتی دیکھ کر اسے غصہ آگیا "میری بیٹی کا رشتہ ٹوٹنے پر تمہیں خوشی ہو رہی ہے؟"

"بات ہی خوشی کی ہے" رشیدہ نے ڈھٹائی سے کہا پھر کبریٰ کے تیور بگڑتے دیکھ کر جلدی سے وضاحت کی "اب تمہاری بیٹی کا ایسا رشتہ کراؤں گی کہ تم نے خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔"

"سچ؟" کبریٰ کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"سامنے والی پکی بستی میں شیخ صاحب رہتے ہیں۔ بہت بڑا بنگلا ہے ان کا۔ کئی تو کارخانے ہیں۔ انہوں نے تمہاری صغریٰ کو دیکھا اور اس پر ریجھ گئے۔ اکلوتا بیٹا ہے ان کا۔ خوب صورت' پڑھا لکھا' کوئی کمی نہیں۔ مجھ سے بات کی' میرے منہ سے نکل گیا کہ اس کی تو بات پکی ہو چکی ہے۔ اب شادی ہونے والی ہے۔ سچی بات ہے بہن' میں کہہ کر پچھتائی' وہ ایک دم بجھ گئے۔ میں نے کہا بھی کہ پھر بھی کوشش کرتی ہوں۔ بولے نہیں' میں پیسے کے زور پر کسی کی خوشی خراب نہیں کرسکتا۔ رہنے دو' ہمارے نصیب میں نہیں۔ پر بچی مجھے بہت اچھی لگی تھی۔"

"بہت ہی نیک آدمی ہوں گے" کبریٰ نے کہا۔

"پنج وقتہ نمازی ہیں۔ پانچ سال پہلے بیوی فوت ہوگئی تھی پھر شادی نہیں کی۔"

"تو اب ---؟"

"آج ہی جاکر انہیں بتاؤں گی' کل انہیں لے آؤں گی۔ مگر مجھے تو لگتا ہے کہ وہ آج ہی دوڑے آئیں گے" رشیدہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"رکو تو سہی۔ منہ تو میٹھا کرلو۔ کل رات مٹھائی لائی تھی میں۔"

"منہ تو ضرور میٹھا کروں گی مگر رکوں گی نہیں۔ میں تو ابھی جاؤں گی شیخ صاحب کے پاس۔"



وہ عید کا دن سب سے بڑی خوشی کا دن بن گیا!

لیکن کبریٰ مخمصے میں تھی۔ اتنے بڑے لوگ! اسے رہ رہ کر فکر ستاتی کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہوگی۔ لڑکے میں کوئی نقص نہ ہو۔ پیسے والے ہیں تو میری بچی کو حقیر نہ سمجھیں ساری زندگی۔ آخر انہیں ہم غریب کیسے بھاگئے۔ ضرور کوئی ایسی ویسی بات ہے۔

مگر پھر اس کے اندر ایک آواز ابھری' اللہ کی عنایت صاف شفاف اور بے داغ ہوتی ہے' اور اس کے دل کو قرار آگیا۔

شیخ صاحب شام کو ہی آگئے۔ انہیں دیکھتے ہی کبریٰ کے سب واہمے دور ہوگئے۔ شیخ صاحب کے ساتھ ان کا بیٹا بھی تھا۔ خوبرو' خوش گفتار' ایسے داماد کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اس کے دل سے صدائے شکر بلند ہوئی۔

"میں ذیشان کو بھی ساتھ لے آیا تاکہ تم بھی اسے دیکھ لو۔ ممکن ہے' تمہیں بعد میں پسند نہ آئے" شیخ صاحب نے کہا۔

"یہ تو لاکھوں میں ایک ہیں جناب!" کبریٰ نے عاجزی سے کہا۔

"برا نہ مانو تو بیٹی صغریٰ کو بھی بلا لو بہن۔ یہ دونوں بھی ایک دوسرے کو دیکھ لیں۔ زندگی تو انہیں گزارنی ہے۔"

وہ دونوں ساتھ کھڑے ہوئے تو چاند سورج کی جوڑی بن گئی۔

"دیکھو بہن' تمہاری بیٹی اتنی انمول ہے اور میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ مجھے اس بیٹی کے سوا کچھ نہیں چاہیے۔ میں عید کے دسویں دن مختصر سی برات لاؤں گا۔ منظور ہے؟"

"جی شیخ ---"

"بھائی صاحب کہو نا' میں نے تمہیں بہن کہا ہے۔"

"جی بھائی صاحب' مجھے منظور ہے" کبریٰ نے دل میں کہا "دل و جان سے۔"

"بس تو بات پکی ہوگئی۔ ذیشان' لو بیٹے ---- صغریٰ بیٹی کو یہ انگوٹھی پہنا دو "شیخ صاحب نے بیٹے کی طرف مخملیں کیس بڑھایا۔

اور وہ انگوٹھی ایسی حسین تھی کہ اسے دیکھ کر کبریٰ کو متبرک اشرفیاں یاد آگئیں۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

جاتے جاتے شیخ صاحب نے بے حد عاجزی سے کہا "میں تم سے کچھ اور بھی مانگنا چاہتا ہوں بہن !"

کبریٰ نے حیرت سے انہیں دیکھا "جی --- میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔"

"جو دے سکتی ہو' وہ مانگوں گا۔ بس مایوس نہ کرنا۔ دیکھو میں نے تمہیں بہن کہا اور خود کو تمہارا بھائی سمجھ لیا۔ صغریٰ کی رخصتی کے بعد تمہیں اکیلا کیسے چھوڑ سکتا ہوں اور پھر ذیشان کی ماں کے بعد میرا گھر بھی سونا اور بدنظمی کا شکار ہے۔ کوئی خیال رکھنے والا۔ انتظام کرنے والا نہیں۔ میری بہن' تم اسے سنبھال سکتی ہو۔ صغریٰ تو بہت چھوٹی ہے۔"

"لیکن بھائی صاحب ---"

"بھائی صاحب کہتی ہو تو بات بھی مانو گی' ٹھیک ہے نا۔"

کبریٰ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے "ٹھیک ہے بھائی صاحب۔ آپ مجھے لینے آئیں گے' میں آپ کے ساتھ چلی چلوں گی۔"

"جیتی رہو بہن !" شیخ صاحب نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ لوگ چلے گئے۔ کبریٰ ہی نہیں' صغریٰ بھی حیران تھی۔ چند گھنٹوں میں ایسی کایا پلٹ بھی ہوسکتی ہے؟ نئی' خوب صورت' بابرکت اور خوش حال زندگی ان کے لئے اپنی بانہیں پھیلائے کھڑی تھی۔



میں یہ سب کچھ لکھنے کے بعد دیر تک ساکت وصامت بیٹھا رہا۔ اللہ کی رحمت'

تائید اور خیر و برکت کیسی ہوتی ہے' یہ میں دیکھ چکا تھا لیکن اس واقعے نے میرے دل کے تاروں کو جھنجھنا کر رکھ دیا تھا۔ ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا۔ کوئی ایسے مہربان' رحم والے اور کریم رب کا شکر ادا کرسکتا ہے؟

پھر میرے ذہن میں اس سوال کا جواب ابھرا "کیوں نہیں' کرسکتا ہے لیکن شکر کا حق کوئی ادا نہیں کرسکتا۔"



وہ ۳۰ جون ۹۸ء کی رات تھی۔ مجھے بابا عصر سے ملتے ہوئے تقریباً ڈھائی سال ہوچکے تھے۔ اس رات میں نے بابا عصر کے چہرے پر طمانیت اور ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی جو میرے لئے بالکل نئی چیز تھی "آج آپ بہت خوش ہیں بابا !" میں نے ان سے پوچھا۔

"ہاں۔ آج کام کا --- کہانی کا ایک مرحلہ مکمل ہو رہا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"ایک مرحلے سے کیا مراد ہے آپ کی؟"

"آگے کیا ہوگا' یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔ کون سعادت پائے گا اور کس کو ذلت اور رسوائی ملے گی' یہ اسے ہی خبر ہے۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے پوچھا تو وہ بولے "اس سے زیادہ میں سمجھا نہیں سکتا۔ بس جو بھی ہے' سب کے سامنے آجائے گا۔ تم بھی دیکھ لو گے۔ ہمیں تو بس اس کی فکر ہونی چاہیے کہ ہم نے اپنا اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دے دیا ہے اور اس پر ہمیں اللہ کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے۔"

"جی --- بے شک" میں نے دل میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔

"اب تم جاؤ لیکن یاد رکھو' صبح چار بجے اپنے گھر سے نکل آنا۔ میں تمہیں ساتھ لے لوں گا' کہیں چلنا ہے۔"

"صبح چار بجے !" میں نے حیرت سے کہا۔

"یہ ضروری ہے۔ اس کے بعد ہی تمہارے کام کی تکمیل ہوگی۔ بس اب جاؤ۔"

مگر اس سے پہلے کہ میں پلٹتا' ہمیشہ کی طرح وہ خود ہی تیزی سے چلتے لمحوں میں میری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

میں گھر پہنچا تو گیارہ بجے تھے۔ میں نے گھڑی میں ساڑھے تین بجے کا الارم لگایا اور سونے کے لئے لیٹ گیا لیکن میری آنکھوں میں نیند کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ یہ تصور بہت خوش آئند تھا کہ ڈھائی سال پہلے شروع ہونے والا اہم ترین کام مکمل ہونے والا ہے۔ یہ سب اللہ کا فضل و کرم تھا اور اللہ کے فضل و کرم کے سبب سے تھا۔ میرا رواں رواں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے مجھے یہ سعادت عطا فرمائی اور اسے میرے لئے آسان بھی کیا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس دوران میں میری زندگی بدل گئی۔

مجھے تجسس بھی تھا کہ اس کہانی کا اختتام کیا ہوتا ہے۔ میں کہانی لکھنے والا پروفیشنل ہوں۔ مگر اس کہانی کا انجام' اس کا وائنڈ اپ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ایسی عجیب حقیقت تو میں نے کہانی میں بھی کبھی نہیں لکھی تھی۔

قصہ مختصر یہ کہ اس رات نیند میری آنکھوں کے قریب بھی نہیں پھٹکی اور یوں ہوا کہ اس بیداری نے مجھے مضمحل بھی نہیں کیا۔ میں تازہ دم تھا۔

سوا تین بجے میں بستر سے اٹھ گیا۔ میں نے گھڑی کا الارم بند کر دیا۔ باتھ روم سے غسل کر کے میں باہر آیا اور میں نے شکر کے نوافل ادا کیے۔ اب ہر لمحہ میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ جسم میں دوڑنے والی سنسنی ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں بے چین اور مضطرب تھا لیکن اس بے چینی اور اضطراب میں بے سکونی نہیں تھی' طمانیت اور سکون تھا۔

پونے چار بجے میں گھر سے نکل آیا۔ بلڈنگ کے چوکی دار نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ لیکن کچھ کہے سنے بغیر میرے لئے گیٹ کھول دیا۔ میں باہر نکل آیا۔ صبح کی خوش گوار ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی لیکن بری نہیں لگ رہی تھی۔ میں ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ وقت کا احساس ہی نہیں رہا۔

اچانک جیسے کسی ہوا کے لطیف جھونکے نے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ میں پلٹ کر دیکھنا چاہتا تھا مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ مجھے برابر سے بابا عصر گزرتے نظر

آئے اور اگلے ہی ثانیے وہ مجھ سے آگے نکل گئے "چلو --- قدم بڑھاؤ نا۔ کھڑے کیوں ہو؟" انہوں نے کہا۔

ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔ میں چل رہا ہوتا تھا مگر انہیں ٹھہرا ہوا لگتا تھا --- شاید اپنی تیزی رفتار کی وجہ سے۔ بہرحال میں تیز قدموں سے ان کے پیچھے چل دیا۔ میرا تجسس سے برا حال تھا۔ اچانک میری نظر بابا عصر کے ہاتھ پر پڑی۔ ان کے ہاتھ میں ایک بے حد خوب صورت اور کافی بڑا رومال تھا۔ اس میں کوئی چیز بندھی ہوئی تھی' جس کی وجہ سے وہ پوٹلی جیسا لگ رہا تھا۔ اس کی وجہ سے میرے تجسس کو استفسار کا راستہ مل گیا "بابا --- یہ آپ کے ہاتھوں میں کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

انہوں نے چلتے چلتے سر گھما کر مجھے دیکھا "اس میں وہ نورانی اشرفیاں ہیں جن کے سفر میں تم شریک رہے ہو۔ جن کا سفرنامہ تم لکھتے رہے ہو۔"

میں نے بے یقینی سے اس رومال کو دیکھا۔ "دو اشرفیاں تو نہیں لگتیں یہ۔" میں نے کہا۔ "یہ پوٹلی اتنی بڑی کیوں لگ رہی ہے؟"

میں نے کب کہا کہ یہ دو اشرفیاں ہیں "بابا عصر تیکھے لہجے میں بولے "یہ بہت ساری اشرفیاں ہیں۔" انہوں نے کہا اور چلتے چلتے ہی رومال کھول کر مجھے دکھایا۔

میں نے دیکھا اور حیران ہوا۔ وہ واقعی بہت ساری اشرفیاں تھیں۔ میں انہیں گن بھی نہیں سکتا تھا --- اور سب ایک جیسی تھیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے وہ رات یاد آگئی جب میری کایا پلٹ ہوئی تھی۔ "یہ اتنی بہت سی کیسے ہوگئیں؟"

بابا عصر نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں کوئی نادان بچہ ہوں۔ "کراچی پاکستان نہیں۔ نہ ہی یہ پاکستان کا واحد شہر ہے۔ خیر و برکت کا یہ سفر ہر بڑے چھوٹے شہر میں شروع ہوا تھا۔ اور یہ پاکستان کے چھوٹے سے چھوٹے گاؤں تک پہنچی تھی۔ اللہ خود کسی کو خیر سے محروم نہیں کرتا' وہ بڑا کریم ہے۔"

"اوہ' تو یہ بات ہے" بات کچھ میری سمجھ میں آنے لگی۔ میں نے سوچا' یہ بات تو مجھے خود ہی سمجھ لینی چاہیے تھی۔ "مگر یہ سب آپ کے پاس ---؟"

وہ پھر مسکرائے "آخری مرحلے کی تکمیل سے پہلے انہیں میرے پاس اکٹھا ہونا تھا۔"

"تو اب کیا ہوگا؟"

"خود ہی دیکھ لینا۔ اب انہیں آخری ہاتھوں میں جانا ہے --- آخری آدمی کے پاس۔ دعا کرو کہ وہ آخری آدم ہی ثابت ہو" آخری بات کہتے کہتے ان کے لہجے میں تشویش در آئی "اگر وہ اہل' امین اور دیانت دار ثابت ہوا تو یہ اشرفیاں قومی خزانے میں پہنچ جائیں گی۔ پھر یہاں ایک نیا دور شروع ہوگا۔ پاکستان کے استحکام اور اسلام کی سربلندی کا دور۔ کفرو باطل کی ہزیمت کا دور۔ جہاد فی سبیل اللہ کا دور۔ شہادت کے اعزاز تقسیم ہوں گے" ان کا لہجہ خواب ناک ہوگیا۔

"اور اگر خدانخواستہ وہ آخری آدمی اہل' امین اور دیانت دار ثابت نہ ہوا تو ---؟"

"پھر وہ بدنصیب ثابت ہوگا۔ اپنی دنیا اور آخرت ایک ساتھ گنوا دے گا" بابا عصر نے افسردگی سے کہا۔

تجسس مجھے بے صبرا بنائے دے رہا تھا۔ مجھے آخری آدمی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس وقت مجھے یہ تجسس بھی نہیں تھا کہ یہ آخری آدمی کون ہے۔ میں نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے --- یہ بتائیں کہ پھر ہوگا کیا؟"

"اشرفیاں واپس میرے پاس آجائیں گی" بابا عصر نے دل گرفتہ لہجے میں کہا "پھر اس کے متبادل کا انتظار کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر تو اشرفیاں قومی خزانے میں نہیں پہنچ سکتیں۔"

"اور اگر خدانخواستہ وہ متبادل بھی اہل' امین اور دیانت دار نہ ہوا تو؟"

"اللہ نہ کرے۔ لیکن ایسا ہوا تو انتظار اور طویل ہو جائے گا" بابا کے لہجے میں گھبراہٹ تھی "لیکن مجھے امید ہے۔ اور اللہ سے میری دعا ہے کہ ایسا نہ ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ اس موجودہ آخری آدمی نے یہ اعزاز گنوا دیا تو اس کی جگہ لینے والا انشاء اللہ تمام اہلیتوں اور سعادتوں سے مالا مال ہوگا۔ کیونکہ معرکے کا وقت بہت قریب ہے۔ آگے اللہ کی مرضی' وہی جانے۔"

نہ جانے کیوں میں بھی اداس ہوگیا۔ ڈھائی سال میں تو یہ مرحلہ طے ہوا تھا اور اس دوران میں قومی معیشت تباہی کے دہانے تک پہنچ گئی تھی۔ ملک دوالیہ ہونے کے

قریب تھا۔ یہ خیال ہی روح فرسا تھا کہ خدانخواستہ ابھی اور دیر لگ سکتی ہے۔

"دل چھوٹا نہ کرو" بابا عصر نے مجھے دلاسا دیا "حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں' مایوسی کفر ہے۔ اللہ مسبب الاسباب بھی ہے اور قادر مطلق بھی۔"

اب مجھے اس پر حیرت نہیں ہوتی تھی کہ بابا عصر میری سوچیں پڑھ لیتے ہیں۔

میں چلتا رہا۔ اچانک میرے دل میں خواہش ابھری کہ میں ان متبرک اشرفیوں کو اٹھا کر چلوں۔ میں نے یہ بات بابا عصر سے کہی۔ وہ عجیب نظروں سے مجھے دیکھنے لگے پھر بولے "یہ بہت زیادہ ہیں' تم اٹھا نہیں سکوگے۔"

مجھے حیرت ہوئی۔ وہ اتنا سا تو رومال تھا۔ اشرفیاں یقیناً بہت زیادہ تھیں۔ لیکن اتنی بھی نہیں کہ میں اٹھا نہ سکوں "میں اٹھالوں گا" میں نے کہا۔

انہوں نے بڑی احتیاط سے وہ پوٹلی مجھے دی مگر اسے تھامتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ جتنی بڑی نظر آرہی ہے' درحقیقت اس سے بہت بڑی ہے اور ان اشرفیوں کا بوجھ! اسے لے کر ایک قدم چلنا تو درکنار' میں سیدھا کھڑا بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ میری ٹانگیں کانپنے لگیں اور پوٹلی ہاتھ سے چھوٹنے لگی۔

بابا عصر نے بڑی پھرتی سے اسے تھام لیا "یہ بڑی بھاری امانت ہے" انہوں نے وضاحت کی "ہزاروں مل کر اٹھائیں تو بھی یہ آسان بوجھ نہیں۔"

میں انہیں حیرت سے دیکھتا رہا۔ وہ اتنا بوجھ لے کر بھی اتنے تیز قدموں سے چل رہے تھے۔ جبکہ میں نے اس پوٹلی کو پوری طرح تھاما بھی نہیں تھا تو مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ جیسے میں بھاری سامان سے لدے ہوئے کسی ٹرک کو ہلانے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں۔

ہم چلتے رہے۔ اچانک میرے تجسس نے رخ بدلا۔ مجھے خیال آیا اور میں نے پوچھ لیا "یہ آخری آدمی کون ہے؟"

"خود دیکھ لینا' اب ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔"

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ ہم اس وقت ایک پختہ سڑک پر چل رہے تھے۔ مجھے حیرت ہوئی۔ وہ گرد و پیش مجھے بے حد اجنبی سا لگ رہا تھا اور پھر صبح کی اس ہلکی روشنی میں' میں نے جو کچھ دیکھا' اس نے مجھے حیران کر دیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین

نہیں آ رہا تھا۔

یادگار پاکستان کے مینار نے میرے ہوش اڑا دیے تھے۔ میں نے آنکھیں مل کر دیکھا مگر وہ خواب یا میرا تصور ہرگز نہیں تھا۔ "بابا --- یہ ---"

"ہاں۔ ہم لاہور میں ہیں۔"

"لیکن یہ کیسے --- ہم تو کراچی میں تھے؟"

"اللہ کے بھید وہی جانے۔ اس میں تجسس نہ کرو۔ جیسے آئے ہو' ویسے ہی واپس بھی پہنچ جاؤ گے۔"

اب ہم شاید کسی بہت بڑے باغ میں تھے۔ ہمارے قدموں کے نیچے سبزہ تھا۔ اجالا تیزی سے پھیل رہا تھا۔ میں نے سر گھما کر دیکھا تو دور مجھے ایک بڑا آہنی گیٹ نظر آیا۔ وہاں دس بارہ مسلح پہرے دار بھی تھے۔ مجھے لگا کہ وہ کسی بڑے اور اہم عہدے دار کی رہائش گاہ ہے۔ شکر ہے کہ ہم اس کے باہر اور اس سے خاصا دور تھے۔ ورنہ پہرے داروں کے سامنے جواب دہی مشکل ہو جاتی۔ مگر اسی لمحے بابا عصر کے قدم گیٹ کی سمت اٹھنے لگے "اسطرف کیوں جا رہے ہیں؟" میں نے فریاد کی "دیکھتے نہیں' وہ کسی بڑے آدمی کی رہائش گاہ ہے۔"

"وہ کیوں کہہ رہے ہو؟" بابا عصر نے مجھے ڈانٹا "رہائش گاہ میں تو ہم موجود ہیں۔ یہ جہاں ہم چل رہے ہیں' یہ اس گیٹ کے اندر کا حصہ ہے' باہر کا نہیں۔"

میں نے سر گھما کر دیکھا تو اقامتی عمارت نظر آئی۔ میری تو گھگی بندھ گئی "مروا دیا۔ آپ نے۔ گارڈ تو دیکھتے ہی گولی مار دیں گے ہمیں" میں نے بلبلا کر کہا۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ ہم آخری آدمی سے ملنے آئے ہیں" بابا عصر کا لہجہ پرسکون تھا۔

مگر بعد میں بری طرح دہل گیا تھا۔ اسی لمحے گیٹ کھلا اور ایک کار اندر آتی دکھائی دی۔ گیٹ پھر بند کر دیا گیا۔

کار جس وقت جہاں رکی' اسی وقت ہم بھی وہاں پہنچے تھے۔ کار کا دروازہ کھول کر جو شخص باہر آیا' اسے دیکھ کر میں تو سناٹے میں آ گیا لیکن بابا عصر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

کار سے اترنے والا شخص اسلامی جمہوریہ پاکستان کا وزیراعظم تھا!



وقت جیسے ٹھہر گیا تھا!

وزیر اعظم کے لئے بھی وہ شاک تھا۔ دو مداخلت کار سخت سیکیورٹی کے باوجود ان کے گھر میں موجود تھے۔ وہ حیرت اور تشویش سے ہمیں دیکھ رہے تھے بلکہ ہمیں نہیں مجھے کہئے۔ سفید سن بابا عصر انہیں خطرناک نہیں لگ رہے تھے البتہ مجھے دیکھ کر وہ یہ سوچ رہے تھے کہ میرے عزائم خطرناک تو نہیں۔

لیکن مجھے ان پر فخر محسوس ہوا۔ اس صورت حال نے انہیں Panic میں مبتلا نہیں کیا تھا۔ وہ تشویش زدہ ضرور تھے لیکن پریشان نظر نہیں آ رہے تھے۔ کار میں وہ اکیلے تھے۔ خود ہی ڈرائیو کر کے لائے تھے۔

پھر خاموشی ہماری طرف سے ہی ٹوٹی۔ میں نے اور بابا عصر نے انہیں بیک وقت سلام کیا۔ ان کے چہرے سے پریشانی کا سایہ ہٹ گیا۔ اب وہ شرمندہ نظر آ رہے تھے۔ شاید اس بات پر کہ انہوں نے سلام کرنے میں پہل کیوں نہیں کی۔ انہوں نے سلام کا جواب دیا پھر بولے "آپ لوگ کون ہیں؟ اور یہاں کیسے گھس آئے ہیں؟"

"اللہ کی مرضی پر چلنے والے تو کہیں بھی پہنچ سکتے ہیں" بابا عصر نے کہا "کون روک سکتا ہے انہیں۔"

وزیراعظم نے گیٹ کی طرف سر گھمایا۔ شاید وہ سیکیورٹی والوں کو آواز دینا چاہتے تھے مگر بابا نے انہیں روک دیا "اس وقت وہ اندھے اور بہرے ہیں۔ نہ ہماری باتیں سن سکتے ہیں' نہ ہمیں دیکھ سکتے ہیں۔ اس وقت تم اللہ تعالی کے سیکیورٹی زون میں ہو۔"

وزیراعظم حیران نظر آئے "لیکن کیوں؟"

"میں اللہ کی ایک امانت لایا ہوں تمہارے لئے لیکن مجھے کچھ ہدایات بھی دینی ہیں اور تم سے باز پرس کر کے تمہیں تنبیہہ بھی کرنی ہے۔"

اب میں بھی حیران تھا کہ کہانی یہاں کہاں پہنچ گئی۔ ادھر وزیراعظم کے چہرے پر

تردد کا سایہ ابھرا۔

"باز پرس سے ڈرتے ہو --- یا ہتک کا احساس ہو رہا ہے" بابا عصر نے تیز لہجے میں پوچھا۔ وزیراعظم نے کوئی جواب نہیں دیا "کیا تم نہیں جانتے کہ اسلامی مملکت کے سربراہ سے تو ایک عام شہری بھی جواب طلب کرسکتا ہے --- اور وہ جواب دے کر اسے مطمئن بھی کرتا ہے۔ کیا تمہیں یہ احساس نہیں کہ یہ اقتدار تمہارے پاس اللہ کی امانت ہے اور اس کی جواب دہی اتنی سخت ہوتی ہے کہ حضرت عمر جیسی ہستی کو خوف کے مارے نیند نہیں آتی تھی۔"

وزیراعظم کے چہرے پر نرمی اور آنکھوں میں روشنی بکھر گئی۔ "جی --- میں جانتا ہوں۔ مجھے احساس ہے" انہوں نے آہستہ سے کہا "آپ باز پرس ضرور کریں مجھ سے۔"

"مطمئن تو تم ایسے ہو کہ کوئی متقی بھی نہیں ہوتا" بابا عصر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ وزیراعظم کا چہرہ تمتما اٹھا لیکن وہ کچھ بولے نہیں۔ بابا عصر چند لمحے ان کی آنکھوں میں دیکھتے رہے، پھر بولے "کشکول تم نے توڑ دیا، بہت اچھا کیا۔ مگر یہ کیا کہ اپنے دامن کو ہی بھکاری کی جھولی بنا کر بیٹھ گئے۔"

وزیراعظم کا چہرہ پھر تمتمایا "میرے محترم بزرگ، آپ کو اندر کا حال نہیں معلوم۔"

"بے شک، مجھے نہیں معلوم لیکن اللہ اقتدار کے ایوانوں کے اندر کا حال بھی جانتا ہے اور اسے تمہارے اور تمہارے رفقا کے اندر کا بھی سب حال معلوم ہے۔"

وزیراعظم کے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ لرزش واضح طور پر نظر آئی تھی "جی بے شک۔ یہ تو ہمارا ایمان ہے۔"

"لیکن اسے بھول کر بے ایمان ہو جاتے ہو۔ ورنہ اس کی نافرمانی کرتے ہوئے خوف سے مر جاؤ۔ پتہ ہے، جس اقتدار کی آرزو میں تم سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہو، تقویٰ کرنے والے اس کے ملنے کے امکان سے بھی تھرتھر کانپتے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں میرے بزرگ۔ میں بہت گناہ گار آدمی ہوں۔"

"یہ کہہ دینے سے کچھ نہیں ہوتا" بابا عصر نے سخت لہجے میں کہا "یہ کیا کہ

گنہگاری کا اعلان کرتے رہو اور اسی دوران میں ڈھٹائی سے گناہ بھی کیے جاؤ" اچانک ان کا لہجہ نرم ہوگیا "اللہ کا شکر ادا کرو۔ یہ اس کی عنایت ہے کہ یہاں دنیا میں اس کے حکم سے میں کھڑا تم سے جواب طلب کر رہا ہوں۔ ذرا سوچو، سوا نیزے کی بلندی پر تپتے سورج کے نیچے حشر کی دھوپ میں اعمال نامہ ہاتھ میں لیے جواب دہی کے مرحلے سے گزرو گے تو کیا حال ہوگا تمہارا۔ وہاں نہ توبہ کا موقع ہوگا، نہ ہی مال و دولت دے کر جان چھڑا سکو گے۔"

وزیراعظم تھرتھر کانپنے لگے۔ ان کے کپکپاتے ہونٹوں پر شاید استغفار تھا "خزانہ خالی ہے۔ اور ایٹمی دھماکا ناگزیر تھا۔" انہوں نے لرزتی آواز میں کہا۔

"عمل کا دار و مدار نیت پر ہے۔ اللہ نیتوں کا حال جانتا ہے۔ اسی لیے جزا و سزا کا اختیار صرف اسی کے پاس ہے۔ دھماکا کیسے ہوا، کس نے کرایا، وہ سب جانتا ہے" بابا عصر نے آسمان کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا "وہ جس نے موسیٰ علیہ السلام کی پرورش فرعون کے ہاتھوں لاڈ پیار سے کرائی، وہ دھماکا دشمنان اسلام کے ہاتھوں بھی کرا سکتا ہے۔ رہی تمہاری خزانے والی بات تو خزانہ تو برسوں سے خالی چل رہا ہے لیکن مقتدرین کے صرف تعیشات میں تو کمی نہیں ہوئی بلکہ زیادتی ہی ہوئی۔ بڑی بڑی کاریں، ذاتی استعمال کے لئے ہوائی جہاز، محلوں کی آرائش، پرتکلف ضیافتیں۔ یہ سب دیکھ کر کوئی مان سکتا ہے کہ خزانہ خالی ہے۔ اور اب ایٹمی دھماکے کی بات کرو۔ وہ ملک و قوم کی ضرورت تھا یا حکومت کی؟"

"سب جانتے ہیں کہ وہ ملک و قوم کی ضرورت تھا۔" وزیراعظم نے دبے لفظوں میں کہا۔

"لیکن تمہارے نزدیک وہ حکومت کی ضرورت تھا، یہ تو کم ہی لوگ جانتے ہیں۔ تباہ معیشت، خالی خزانے اور اپنی اور اپنے پچھلوں کی بداعمالیوں اور بے ایمانیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے بھی تو تمہیں اس دھماکے کی ضرورت تھی۔ ملک اور قوم کو تو بونس میں فائدہ ہوا اس لئے ہوا کہ یہ اللہ کی مرضی تھی۔ حکومت کو یہ فائدہ ہوا کہ پہلے وہ اقتصادی دوالیے پن کا اعلان نہیں کرسکتی تھی، اب کر رہی ہے۔ اب تم تمام بدعنوانیاں اور بے ایمانیاں --- اپنی بھی اور اپنے سے پہلوں کی بھی --- بین

الاقوامی اقتصادی پابندیوں کے کھاتے میں ڈال کر بری الذمہ ہو جاؤ گے۔"

وزیراعظم کی پیشانی پر شکنیں ابھریں لیکن ان کا تحمل قابل رشک تھا۔

"یہ بتاؤ کہ دھماکے کے اعلان کے وقت تو تم بہت پرامید تھے۔ تمہیں اقتصادی پابندیوں کی بھی پروا نہیں تھی۔ تم کہہ رہے تھے کہ ہنگامی منصوبہ تیار ہے۔ انقلابی تبدیلیاں آئیں گی اور ہم انشاء اللہ پہلے سے زیادہ خوش حال اور طاقت ور بن کر ابھریں گے۔ تو اتنے سے دنوں میں اب کیا ہوگیا؟"

"دیکھیں، ہم نے خود انحصاری کی اسکیم شروع کی ---"

"اور وہ بہت کامیاب ہوئی" بابا عصر نے ان کی بات کاٹ دی۔ "ملک و قوم سے محبت کرنے والوں نے فاقہ کرکے بھی اس میں کم از کم سو روپے دیئے۔ صاحب حیثیت لوگوں نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا" بابا کہتے کہتے رکے۔ ان کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھری "تم نے اس اسکیم میں خود کیا دیا؟"

وزیراعظم کا چہرہ پھر تمتما اٹھا "اس کی تشہیر کرنے کی کم ظرفی میں نہیں کرسکتا" انہوں نے قدرے بدمزگی سے کہا۔

"حالانکہ اس کی تشہیر ضروری ہے۔ تمہاری قربانی، تمہاری شمولیت لوگوں کے جذبوں کو مہمیز کرے گی اور تمہاری کابینہ میں بھی تو بڑے صاحب ثروت لوگ موجود ہیں۔ کچھ پچھلے چند برسوں میں صاحب ثروت بن گئے ہیں، انہوں نے اس اسکیم میں کچھ دیا؟"

"دیا ہوگا لیکن میں ان کا ذمے دار نہیں۔"

"کیا بکتے ہو؟" بابا عصر کو جلال آگیا "میں اللہ کے آئین کو درمیان میں نہیں لاتا۔ لیکن اس آئین کے تحت تم وزیراعظم بنے ہو، اسی کے تحت وزیراعظم اپنی کابینہ کے ہر فعل کے لئے جواب دہ ہوتا ہے۔ ان کی تو کرپشن کے جواب دہ بھی تم ہو، یہاں بھی اور حشر کے روز بھی۔"

وزیراعظم کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"اب میں تمہیں اسکیم میں صاحب اقتدار لوگوں کے عطیات کی تشہیر کی افادیت بتاؤں" بابا عصر کا لہجہ نرم ہوگیا "اللہ نے فرمایا کہ عمل کے اجر کا انحصار نیت

پر ہے۔ اب سوچو کہ ایک طالب علم ہے، جس نے اپنا دل مار کر، اپنی خواہشوں سے محرومی کے بدلے کچھ رقم جمع کی۔ فرض کرلو --- ڈیڑھ سو روپے اور اس میں سے سو روپے اس نے تمہارے خود انحصاری فنڈ میں دے دیئے۔ یہ ہوا کل رقم کا تقریباً ۶۷ فیصد۔ اور کسی کے پاس دس کروڑ روپے ہیں اور اس نے فنڈ میں دس لاکھ روپے دیئے۔ یہ کل رقم کا صرف ایک فیصد ہے۔ یعنی دنیاوی اعتبار سے وہ طالب علم اس کروڑ پتی کے مقابلے میں ۶۷ گنا عظیم ہے۔ اب اللہ کے حساب سے سوچو، جو سب کچھ جانتا ہے۔ نیت بھی اور اندر کی بات بھی۔ آخرت میں اس طالب علم کی ان ضرورتوں کا حساب ہوگا، جو سو روپے کے اس عطیے کی وجہ سے پوری نہ ہوسکیں۔ محرومی دے گئیں اسے۔ اور وہاں اس کروڑ پتی کا بھی حساب ہوگا جس کی کوئی خواہش تشنہ تکمیل نہیں۔ کوئی ضرورت پوری ہونے سے نہیں رہتی۔ اور اس کے پاس دس کروڑ روپے بے مصرف پڑے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ ماہانہ آمدنی کے وسائل بھی ہیں۔ ایسے میں اس کے دس لاکھ کی وقعت صفر سے نیچے تو ہوسکتی ہے، اوپر نہیں ہوسکتی۔ یعنی ہم حساب نہیں لگا سکتے کہ آخرت میں اس طالب علم اور اس کروڑ پتی کے عطیوں کے درمیان کتنے ہزار یا کتنے لاکھ گنے کا فرق ہوگا۔"

میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں نے کبھی اس زاویئے سے سوچا ہی نہیں تھا۔

"میرے بزرگ، گستاخی معاف۔" وزیراعظم چند لمحے سوچنے کے بعد بولے۔ "ہمیں تو پیسے کی ضرورت ہے --- زیادہ سے زیادہ۔ سیدھی سی بات ہے کہ ان سو روپوں کے مقابلے میں وہ دس لاکھ ہماری زیادہ مدد کریں گے۔"

"تم غلطی پر ہو۔" بابا عصر مسکرائے "شیطان کی دی ہوئی افراط اللہ کی عطا کردہ برکت کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے کبھی تعداد یعنی افراط پر زور نہیں دیا۔ نیکی ہمیشہ گنتی میں کم اور وزن اور تاثیر میں بیش ہوتی ہے۔ کافروں نے اپنی کثیر تعداد کے باوجود گنتی کے مومنوں سے ہمیشہ شکست کھائی۔ ہاں، افراط اللہ کی دی ہوئی ہو تو آزمائش ہوتی ہے۔ آدمی اللہ کی راہ میں خست اور تنگی کرے تو اس کے مال میں بے برکتی بھی آتی ہے اور وہ اس کے لئے وبال بھی بن جاتا

ہے۔ حق حلال کے سو روپے کو حقیر سمجھنے کی غلطی کبھی نہ کرنا۔"

وزیراعظم کے چہرے پر شرمندگی تحریر تھی "آپ درست فرماتے ہیں" انہوں نے بے حد احترام سے کہا۔

"اب یہ بتاؤ کہ جب تم نے دھماکے سے پہلے تمام نتائج پر غور کرکے مکمل منصوبہ بندی کرلی تھی تو اب یہ بار بار کی تبدیلیاں کیسی، جو قوم کو بے یقینی کے عذاب میں مبتلا کررہی ہیں۔"

وزیراعظم چند لمحے سوچتے رہے، پھر بولے۔ "میرے مشیروں اور منصوبہ سازوں سے کہیں چوک ہوگئی۔ مگر انشاء اللہ ہم قابو پالیں گے۔"

"چوک ہوگئی" بابا عصر نے حقارت سے کہا "انہوں نے تو حکومت کا اعتبار ہی ختم کردیا۔ حکومت کو خیانت کار اور احسان فراموش بنا دیا۔ پاکستانیوں میں کتنی ہی خرابیاں سہی، پاکستان کی ضرورت کا سن کر سب لبیک کہتے ہیں۔ وہ جو ملک سے باہر پردیس میں بیٹھے ہیں، انہیں پاکستان سے دوسروں سے زیادہ محبت ہے۔ تم نے جب انہیں مدد کے لئے پکارا، انہوں نے دل کھول کر مدد کی۔ تم نے دولت ملک میں واپس لانے کی اپیل کی، وہ لے آئے۔ اور اب حکومت ان کی تمام جمع پونجی کھاگئی۔ ان کے پاس ڈالر کے بجائے یہ نڈھال اور تھکا ماندہ روپیہ ہے، جس کا حکومت کے قول کی طرح اب کوئی اعتبار نہیں۔ یہ سب کچھ پہلے کبھی کسی حکومت نے نہیں کیا۔ اپنی ضمانت کی حیثیت ہی کھودی۔"

"پہلے کسی حکومت پر یہ وقت بھی نہیں آیا میرے محترم بزرگ!" وزیراعظم نے آہستہ سے کہا "اور لوگوں کی امانت والا زرمبادلہ ہم سے پہلے والے استعمال کرتے رہے ہیں۔"

"یہ کوئی جواز نہیں برائی کا۔ اور تم کو تو یہ جواب دہی بھی کرنی ہے کہ جنہوں نے ایسا کیا، وہ قومی مجرم ہیں۔ انہیں کیا سزا دی تم نے۔ جو قومی دولت لوٹ کر باہر لے جاتے اور معیشت کو کھوکھلا کرتے رہے، ان کے خلاف کیا کارروائی ہو رہی ہے؟"

"ان کے خلاف شواہد اکٹھے کیے جا رہے ہیں، مقدمے قائم ہو رہے ہیں۔"

"اور جنہیں باہر کی عدالتیں مجرم قرار دے رہی ہیں؟"

"وہ عدالتی عمل سے گزر رہے ہیں۔"

"اس سے ملک و قوم کو کیا فائدہ ہوگا؟" بابا عصر نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

وزیراعظم نے انہیں غور سے دیکھا "آپ کے خیال میں کیا ہونا چاہیے؟"

"انصاف ہونا چاہیے اور انصاف صرف سزا دینا نہیں۔ جو لوٹا گیا ہو، اسے اس کا مال بھی واپس ملنا چاہیے" بابا عصر نے سخت لہجے میں کہا "اور یہاں ملک و قوم کی دولت لوٹی گئی ہے۔ اسے بدنامی دی گئی ہے۔ اسے تنگ دستی اور محرومیاں دی گئیں ہیں۔ لہٰذا جو دولت لوٹ کر باہر لے جائی گئی ہے، وہ واپس لاؤ۔ مجرموں کی سزا قید یا موت نہیں، زندگی ہے۔ ان کے پاس یہاں بھی بہت دولت ہے اسے ضبط کرکے قومی خزانے میں لے جاؤ۔ ان سے ان کی زمینیں، جاگیریں اور محل چھین لو۔ انہیں سخت نگرانی میں رکھو اور ملک سے باہر نہ جانے دو۔ ان سے کہو کہ یہاں عام لوگوں کی طرح نوکری کریں، کہیں چار ہزار روپے ماہانہ پر کلرکی کریں۔ کرائے کے مکان میں رہیں اور ذرا عام آدمی کی طرح زندگی گزاریں۔ ایک دو دن نہیں، مہینے نہیں، پوری زندگی۔ پھر انہیں معلوم ہو کہ پائی بھی کتنی بڑی نعمت ہے اور بھوک غریبوں کے معدے میں کس طرح ڈنک مارتی ہے اور دس روپے کی کسی چیز کی فرمائش رد ہونے پر بچوں کی آنکھوں میں آنے والے آنسو ماں باپ کی آنکھوں کی بینائی کیسے چاٹتے ہیں۔ تمہاری سزائے قید تو غریبوں کی زندگی کے مقابلے میں اتنی پرتعیش ہے کہ اگر تم عوام سے اس کا وعدہ کرو تو وہ سب کے سب مجرم بن کر تمہاری جیلوں میں پہنچ جائیں۔ آرام دہ بستر، ٹی وی، مفت کا بہترین کھانا، اخبار اور مانگنے پر ائرکنڈیشنر--- ہونہہ اسے تم سزا کہتے ہو۔ انہیں سزا نہیں، غریبوں کی زندگی دو۔ یہی انصاف ہے اور سنو، یہ سزا بلاتفریق ہر لٹیرے کو دو --- اس کو بھی جو سب کچھ ہوتے ہوئے واپس نہ کرنے کے ارادے سے بینکوں سے قرضے لے کر ملک کو لوٹتا رہا ہے۔ خواہ وہ تمہاری طرف کا ہو، خواہ ان کی طرف کا۔ ان سب کو یکساں طور پر مثال عبرت بنا دو۔"

بابا عصر کے لہجے کا جوش ہر لفظ کے ساتھ بڑھتا گیا تھا اور وزیراعظم کے چہرے

کا رنگ اڑتا جا رہا تھا۔ "یہ میں کیسے کرسکتا ہوں؟" انہوں نے گھبرا کر کہا۔

"کیوں نہیں کرسکتے۔ اقتدار اعلیٰ اللہ کا ہے۔ اقتدار کی امانت تمہارے پاس ہے۔ طاقت اور اختیار ہے تمہارے پاس۔ بس ایک کمی ہے' وہ پوری کرو۔ اپنا سب کچھ قوم کو دے دو۔ کسی چھوٹے سے عام مکان میں رہو۔ جس رقم میں ایک عام آدمی زندگی گزارتا ہے' اسی میں تم بھی گزارہ کرو۔ یوں تمہیں زندگی سے اور اس سے متعلق ان بہت سی چیزوں سے آگہی ہوگی جنہیں تم صرف لفظوں کی شکل میں سمجھتے ہو' عملاً" جانتے نہیں۔ پھر تم لوگوں سے پاکستان کے لیے ایثار اور قربانی کا مطالبہ کرو گے تو اس قربانی اور ایثار کی قیمت بھی سمجھو گے۔ اسلام میں حکمرانی کا اصول ہے کہ لوگوں سے جو کچھ کروانا ہے' خود کرکے دکھاؤ۔ پھر دیکھو' کیا ہوتا ہے۔ سالوں میں نہیں' مہینوں میں ملک و قوم کی قسمت بدل جائے گی۔ اسلام کے ظہور کے موقع پر اسی اصول کے تحت کام کیا گیا تھا۔ تو انسانی تاریخ کا بدترین معاشرہ صرف چند برسوں میں مہذب ترین ہوگیا تھا۔ یہی نہیں' اس کی روشنی مزید چند برسوں میں آدھی دنیا تک پہنچ گئی تھی۔ مثالیں تو تمہارے سامنے ہر طرح کی موجود ہیں۔ چاہو تو اچھی مثالیں منتخب کرلو اور چاہو تو بری' پہلے قربانی تو دو۔"

"میں اس کے لئے تیار ہوں" وزیراعظم نے بڑے اعتماد سے کہا "میں نے اپنی تقریر میں کہا تھا۔۔۔"

"وہ کسی کی لکھی ہوئی تقریر تھی جو کوئی بھی کرسکتا ہے" بابا عصر نے ان کی بات کاٹ دی۔ "جب تم عام بستیوں میں عام لوگوں کے درمیان انہی کی طرح زندگی گزارو گے تو کسی تقریر کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ سب کو خودبخود صرف معلوم نہیں ہوگا' یقین بھی ہو جائے گا۔"

"آپ نے میری بات نہیں سنی" وزیراعظم نے شکایتی لہجے میں کہا "میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ میرے پاس جو کچھ ہے' وہ بہت سے لوگوں کا ملا جلا ہے۔ اس پر مکمل اختیار ایک سربراہ کا ہے۔"

"آدمی کے پاس ارادہ اور عزم ہو' نیت درست ہو تو کوئی مسئلہ ایسا نہیں' جس کا حل نہ ہو" بابا عصر نے بے حد اطمینان سے کہا "پہلے مرحلے میں تم اپنے حصے سے

دستبرداری کا اعلان کر دو۔ پھر وزیراعظم کی حیثیت سے ہدایت کر دو کہ قرضوں کی وصولی کے سلسلے میں کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی جائے' پھر تم عام لوگوں کے درمیان پہنچ جاؤ۔ وہ تنخواہ لو' جو اس ملک میں عام ہے۔"

"لیکن میرے بیوی بچے جس طرز زندگی کے عادی۔۔۔"

بابا عصر نے پھر ان کی بات کاٹ دی "اگر کوئی اور آ کر تم سے یہ سب چھین لے تو تم اور تمہارے بیوی بچے کیا کریں گے۔ مریں گے تو نہیں نا۔ ویسے ہی جئیں گے جیسے میں تمہیں رضا کارانہ طور پر جینے کو کہہ رہا ہوں اور تم سمجھ نہیں رہے ہو۔ یہ اللہ کی راہ ہے۔ بڑی سعادت ہے۔ اس راہ میں بیوی بچے رکاوٹ بنیں تو انہیں چھوڑ دو۔ تم اکیلے محلوں سے اتر کر جھونپڑی میں آجاؤ۔ مثالوں سے آنکھیں چرانے کے بجائے مثالیں قائم کرنا سیکھو۔ تمہارے لوگ تم سے عشق کرنے لگیں گے۔ تمہیں وہ طاقت حاصل ہوگی' جو آئینی ترمیمات اور من پسند آرڈی نینس بھی تمہیں نہیں دے سکتے۔"

"جی ۔۔۔ یہ میں کرسکتا ہوں" وزیراعظم نے پرعزم لہجے میں کہا۔

"پھر تم قومی مجرموں کو میری مجوزہ سزا دو۔۔۔"

"یہ تو نہیں ہوسکتا محترم بزرگ۔ ملکی قانون اس کی اجازت نہیں دیتے۔"

"اپنی مثال قائم کرنے کے بعد تم یہ سب کچھ کرسکتے ہو۔ عوامی طاقت تمہارے ساتھ ہوگی اور قانون کیا ہے ۔۔۔ وہ بھی آدمی کا بنایا ہوا ہے۔ اپنی غرض کے لئے تم آرڈی نینس جاری کر دیتے ہو۔ آئین میں ترمیم کرا کے قانون منسوخ کر دیتے ہو۔ نئے قانون بھی بنا لیتے ہو' ایک اچھے کام کے لئے ایسا نہیں کرسکتے؟"

مگر اب وزیراعظم بے حد پراعتماد نظر آرہے تھے "آپ سمجھ نہیں رہے ہیں میرے محترم بزرگ۔ اس کے لئے دو تہائی اکثریت کی ضرورت ہے۔"

"تو کیا ہوا' وہ تمہارے پاس موجود ہے۔"

"لیکن اس طرح کے کسی قانون کے لئے وہ میرا ساتھ نہیں دیں گے' وہ مجھے ہی فارغ کردیں گے۔"

"اسی لیے نا کہ وہ سب بھی ایسے ہی ہیں اور وہ سب تمہارے منتخب کردہ ہیں

اور تمہاری کابینہ اس کریم کی بھی کریم ہے۔ ہے نا۔ تو تم نے انہیں ٹکٹ کیوں دیئے۔ وزارتیں کیوں دیں؟ کیا تمہارے خیال میں خدانخواستہ اس ملک میں اہل ایمان کا کال پڑ گیا ہے؟"

"یہ سیاسی مجبوریاں ہیں میرے بزرگ!"

"مغربی سیاست کی ہوں گی۔ اسلامی سیاست کچھ اور چیز ہے۔ خیر تم یہ رکاوٹ بھی دور کرسکتے ہو۔ ان سب سے پیچھا چھڑالو۔"

"یہ ممکن نہیں ہے جناب۔ البتہ وہ مجھ سے پیچھا چھڑا لیں گے۔"

"مشورہ میں دیتا ہوں' عمل کرنا نہ کرنا تمہارا کام ہے۔ تم اپنا محل چھوڑ کر غریبوں کے درمیان پہنچ جاؤ ۔۔۔"

"میرا ارادہ یہی تھا محترم۔ لیکن سیکیورٹی کے ایسے مسائل سامنے آئے ۔۔۔"

"کیا کفر بکتے ہو" بابا عصر نے دہاڑ کر کہا۔ ان کا چہرہ تمتما اٹھا تھا "تمہیں یاد نہیں کہ اسلامی تاریخ کے چار بہترین اور مثالی خلفا میں سے تین نے شہادت پائی۔ حضرت عمر اور حضرت علی مسجد میں شہید کیے گئے۔ ان سے زیادہ اہم کون ہوسکتا ہے اور موت تو وہ حقیقت ہے کہ صرف اللہ کے حکم سے آتی ہے اور جب وقت ہو تو سات آہنی پردوں میں چھپا ہوا آدمی بھی اس سے نہیں بچ سکتا۔ اب یہاں کتنی سیکورٹی ہے تمہاری۔ لیکن ہم یہاں تمہارے روبرو کھڑے ہیں اور تمہاری حفاظت کرنے والوں کو پتہ بھی نہیں۔ ہم تو ہدایت لے کر آئے ہیں' موت لے کر آئے ہوتے تو تم اس وقت کہاں ہوتے۔ بتاؤ' اور بات آگے بڑھنے سے پہلے سن لو کہ روشن مثالیں یاد رکھو۔ تم مجرموں کو سزا دینے سے گھبراتے ہو کہ اس پر سیاسی انتقام کا الزام لگے گا۔ تمہیں نہیں ڈرنا چاہیے اس سیاسی بلیک میلنگ سے۔ کیونکہ مجرم قومی مجرم بھی ہیں اور اللہ کے مجرم بھی۔ یاد رکھو' ایک خلیفہ وقت نے اپنے بیٹے کو کس شان سے سزائے موت دی تھی۔ ڈر تھا کہ جلاد کوڑے مارنے میں رعایت سے کام لے گا تو آپ نے خود کوڑے مارے۔ انصاف کے ایک سے زیادہ معیار کبھی نہیں ہوتے۔ یاد رکھو کہ ایک بے حد وسیع و عریض سلطنت کا خلیفہ اپنے گھر میں روشنی کے لئے خزانے سے تیل بھی نہیں لیتا تھا۔ دو بادشاہ تو اس ہندوستان میں بھی ایسے گزرے ہیں

جو اپنی ذاتی ضروریات کے لئے اپنے ہاتھ سے قرآن پاک لکھنے کی مزدوری کرتے تھے۔ اور تم لوگ ہو کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی خزانے پر بوجھ بنتے ہو۔ کہتے ہو' پاکستان مقروض ہے۔ یہ تو بتاؤ' جو قرضہ آتا رہا' وہ گیا کہاں؟ عوام کو کچھ ملا؟ کوئی فائدہ پہنچا؟ سب اقتدار و اختیار والوں نے مل بانٹ کر کھا لیا۔ عوام کو دیا کچھ نہیں۔ ہمیشہ ان سے مانگتے رہے۔ ڈرو اس وقت سے' جب اللہ تم لوگوں سے حساب لے گا اور تمہارے پاس ادائیگی کے لئے اعمال کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ بہتر ہے' یہیں اپنا اپنا حساب کرو۔ پھر تلافی کرو اور توبہ کرو۔ اقتدار کا شوق بہت آسان ہے۔ اقتدار کے بوجھ کا تمہیں اندازہ نہیں۔ انصاف کو کھیل نہ بناؤ۔ چور تمہاری پارٹی کا ہو یا مخالف پارٹی کا' وہ اول و آخر چور ہے۔ اسے سزا دو' انصاف کرو۔ ورنہ اللہ کے انصاف کے منتظر رہو۔ مگر تم نہیں جانتے کہ کیسا انصاف ہوگا۔ جانتے ہوتے تو تم اس سے ڈرتے۔ دیانت دار لوگوں کو پچھلے دس سال کے حسابات کی جانچ پڑتال پر پورے اختیار کے ساتھ مامور کرو اور صاف شفاف گوشوارے قوم کے سامنے رکھ دو۔ اپنا بھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دو۔ تم کہتے ہو' تم اپنی کابینہ کے اراکین کے ذمے دار نہیں اور حضرت عمر کو نیند نہیں آتی تھی ۔۔۔ اس خوف سے کہ اس وسیع و عریض سلطنت میں کوئی کتا بھی بھوکا سو گیا تو اللہ آپ سے جواب طلبی کرے گا۔ یاد رکھو' تم سربراہ ہو۔ کسی کے جرم سے چشم پوشی کرو گے تو وہ جرم تمہارا بھی ہو جائے گا" بابا عصر کہتے کہتے رکے اور ایک گہری سانس لے کر پھر گویا ہوئے "ہاں' میں کہہ رہا تھا کہ اپنا سب کچھ قوم کے لئے ترک کر دو۔ یہ پوری قوم تمہاری جان نثار بن جائے گی۔ پھر تم یہ کرپٹ اسمبلی توڑ دو۔ دوبارہ عوام کے پاس جاؤ۔ اہل' امین' دیانت دار اور سچے افراد کو ٹکٹ دو۔ پاکستان سے محبت کرنے والے عام لوگوں کو آگے لاؤ اور ذمے داریاں سونپو۔ اعتبار کماؤ گے تو لوگ نام نہیں دیکھیں گے۔ تمہارے نشان کو ووٹ دیں گے۔ پھر تم نیک نیتی سے اقدامات کرو۔ انصاف کرو۔ پرانی غلطیاں مت دہراؤ۔ اب تاریخ کے صفحات میں تمہارا نام رقم ہو کر رہے گا۔ یہ تم پر منحصر ہے کہ تم اسے کون سا رنگ دیتے ہو۔"

وزیراعظم کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ چند لمحے بعد انہوں نے سر اٹھایا

"میں اقتدار ہی نہ چھوڑ دوں؟" انہوں نے پرخیال لہجے میں کہا۔

"اب یہ تمہارے اختیار میں نہیں۔ یاد نہیں' ابھی کچھ ہی عرصے پہلے تم بزرگوں کے' اللہ کے محبوب بندوں کے پاؤں پکڑ کر' پیروں میں گر کر گریہ و زاری کر رہے تھے --- گڑگڑا رہے تھے کہ تمہیں ایک موقع اور چاہیے۔ تم نے کیا' کیا کہا تھا' بھول گئے؟ کیا وعدے کیے تھے اللہ سے --- اللہ کو گواہ بنا کر' یاد نہیں اور تمہیں واضح طور پر بتا دیا گیا تھا کہ موقع ملے گا اور وہ آخری ہوگا۔ اگر تم سچے ہوئے تو اس عہد کے رہنماؤں میں تمہیں وہ مقام ملے گا جو شاید ہی کسی کو ملا ہو۔ اور اگر تم جھوٹے ہوئے تو بڑی ذلت اور رسوائی سے جاؤ گے۔ اب تم خود سے نہیں جاسکتے۔"

"جی ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا۔"

"تمہاری خوبیاں اور خامیاں اللہ جانتا ہے مگر تمہاری ایک بہت بڑی خوبی مجھے بھی نظر آتی ہے" بابا عصر کے لہجے میں اس بار شفقت تھی "اور وہ یہ ہے کہ تم پاکستان سے بے حد محبت کرتے ہو۔ اب معلوم نہیں کہ مجھے محبت کرتے ہو کہنا چاہیے یا محبت کرتے تھے کہنا چاہیے۔"

وزیراعظم کی آنکھوں میں آنسو آگئے "میرے محترم بزرگ' میری لغزشیں' میرے گناہ اپنی جگہ۔ اللہ گواہ ہے کہ پاکستان سے مجھے عشق ہے۔"

"عمل سے ثابت کرو نا۔"

"ہمہ وقت یہی کوشش کرتا ہوں مگر رفقا کے غلط مشوروں سے مار کھا جاتا ہوں۔"

"اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ اچھی صحبت میں اٹھو بیٹھو" بابا عصر نے محبت بھرے لہجے میں کہا "بہرحال تم نہیں جانتے کہ تمہیں کتنی بڑی سعادت مل رہی ہے۔ اسے نہ گنواؤ۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا کہ یہ بشارت ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے اور متقی ہیں --- یعنی اس سے ڈرتے ہیں۔ اور تنبیہہ ہے ان لوگوں کے لئے جو غلط راستے پر ہیں اور دل سے ایمان نہیں لائے۔ تمہارے پاس جو ہدایت آئی ہے۔ اگر تم اچھے ہو تو وہ تمہارے لئے بشارت ہے اور تم برے ہو تو تمہارے لئے تنبیہہ ہے۔ دونوں مبارک ہیں۔ تنبیہہ بھی مبارک ہے کہ تمہیں ایک اور

موقع مل رہا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھاؤ اور بشارت پانے والے خوش نصیبوں میں شامل ہو جاؤ۔"

وزیراعظم نے آسمان کی طرف سر اٹھایا' جیسے اللہ سے دعا کر رہے ہوں یا رہنمائی اور استقامت طلب کر رہے ہوں۔ پھر انہوں نے نظریں جھکائیں اور دھیرے سے بولے "اللہ کا شکر ہے۔ اس نے ہمیشہ مجھ پر عنایت فرمائی۔ انشاء اللہ اس بار میں سعادت سے محروم نہیں ہوں گا۔ بے شک عزت اور ذلت اسی کے اختیار میں ہے" پھر انہوں نے نظریں اٹھائیں "آپ نے ابتدا میں فرمایا تھا کہ آپ اللہ کی ایک امانت لائے ہیں میرے لیے۔"

بابا عصر نے رومال کی پوٹلی ان کے سامنے کھول دی۔ "یہ تمہیں قومی خزانے میں پہنچانی ہیں۔"

"اتنا سا کام؟"

"یہ بہت بڑا کام ہے۔ اگر تم متقی' امین' سچے اور دیانت دار ہوئے تو یہ کام کر سکو گے ورنہ نہیں" بابا عصر نے کہا۔ پھر انہوں نے تفصیل سے بتایا کہ وہ اشرفیاں کتنے مرحلوں سے گزر کر آئی ہیں۔ "اس سے اندازہ کرو کہ یہاں کیسے ایمان دار' متقی اور اسلام اور پاکستان سے محبت کرنے والے موجود ہیں" بابا نے کہا "یہ حقیقت تمہیں خود اعتمادی دے گی' قوم پر اعتماد بھی دے گی اور تم آئندہ صالح رفقا کا انتخاب بھی کر سکو گے۔"

وزیراعظم یہ سب کچھ حیرت سے سن رہے تھے' ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

"یاد رکھنا' یہ اشرفیاں لاکھوں ہاتھوں سے گزریں لیکن کسی ایک امین نے بھی اپنے حصے کی اشرفی خود نہیں رکھی۔ وہ بھی آگے بڑھا دی۔"

"مجھے فخر ہے اپنی قوم پر۔"

"کوشش کرو کہ تمہاری قوم بھی تم پر فخر کرے۔"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا" وزیراعظم نے کہا پھر بولے "میں انہیں ہاتھوں میں لے کر دیکھ سکتا ہوں۔"

"کیوں نہیں، تم ان کے امین ہو۔ تمہیں ان کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے۔"

وزیراعظم نے ایک اشرفی اٹھائی۔ انہوں نے حروف پر انگلی پھیری پھر اشرفی کو پلٹ کر دیکھا۔ کلمہ طیبہ کے حروف کو بھی عقیدت سے چھوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ اتنا روئے کہ ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ پھر انہوں نے اشرفی کو چوما اور آنکھوں سے لگا لیا۔

"یہ اشرفیاں قومی خزانے میں پہنچا دو۔ لوٹی ہوئی دولت واپس لو۔ لوگوں کا اعتماد اور اعتبار اپنے اوپر بحال کرو۔ خود کو امین، سچا اور دیانت دار ثابت کرو۔ پھر خیر و برکت دیکھو۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ انشاء اللہ کیسے اچھے دور کا آغاز ہوگا۔ تم کفر کے خلاف جہاد کرو گے۔ غازی یا شہید ہوگے۔ فتح یاب ہوگے اور ہر طرف اسلام کا بول بالا ہوگا۔ آخرت میں سرخروئی ملے گی۔"

"انشاء اللہ" وزیراعظم نے بے حد خلوص سے کہا۔ لیکن اگلے ہی لمحے ان کے چہرے پر مایوسی کا سایہ لہرایا "لیکن حضرت، یہاں بہت برا حال ہے۔ خزانہ خالی ہے، امداد بند ہو چکی ہے ---"

"اسے امداد نہ سمجھو۔ دشمنوں کی امداد بھی ضرر رساں ہوتی ہے۔"

"اور حضرت، قومی معیشت قرض کے بوجھ تلے دبی سسک رہی ہے --- دم توڑ رہی ہے۔"

"غم نہ کرو۔ تم نے افراط دیکھی ہے، خیر و برکت نہیں۔ اللہ کی تائید سے واقف نہیں ہو۔ وہ تمہاری مدد کرے گا۔ جو کچھ زمینوں میں ہے اور آسمانوں میں ہے، صرف وہی جانتا ہے۔ اس کی عنایت ہوگی تو انشاء اللہ جو زمینیں فصلیں نہیں اگلتیں، وہ سونا اور قیمتی دھاتیں، ہیرے اور جواہرات، تیل اور گیس اگلنے لگیں گی۔ تم اللہ پر ایمان رکھ کر جستجو تو کرو۔ لو اب اپنی امانت سنبھالو۔"

مجھے اپنا تجربہ یاد آیا۔ میں نے کہنا چاہا کہ وزیراعظم یہ بھاری بوجھ نہیں اٹھا سکیں گے لیکن جیسے کسی نے میرے ہونٹ سی دیئے۔ اور اگلے ہی لمحے یہ دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کہ وزیراعظم نے اس پوٹلی کو بہت آسانی سے ہاتھوں

میں لے لیا تھا۔

"ایک بات یاد رکھنا" بابا عصر نے وزیراعظم سے کہا "اگر خدانخواستہ تم اہل ثابت نہیں ہوئے تو اس قوم کا عرصہ ابتلا اور طویل ہو جائے گا۔ پھر یہ کام تمہارے پیش رو کو کرنا ہوگا۔ لیکن تم ذاتی طور پر زیادہ بڑے نقصان میں رہو گے۔ تم دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی محروم ہو جاؤ گے اللہ کے انعام سے۔ جو ہونا ہے، وہ تو ہو کر رہے گا اور اللہ کی مرضی نہیں ٹلتی۔ وہ جس سے جو کام چاہے، لے سکتا ہے۔ یہ تمہاری خوش نصیبی ہے کہ تمہیں یہ سعادت مل رہی ہے۔"

"میں یاد رکھوں گا میرے محترم بزرگ!" وزیراعظم نے بے حد احترام سے کہا۔

"اب ہم چلتے ہیں۔ اللہ تمہیں ہمت، استقامت اور سرخروئی عطا فرمائے۔ فی امان اللہ۔"

"فی امان اللہ۔"

میں بابا عصر کے ساتھ گیٹ کی مخالف سمت چلنے لگا۔ اچانک عقب سے ہمیں وزیراعظم نے پکارا۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا "آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا محترم بزرگ!" وزیراعظم نے ہماری طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"یہ آفاق ہے --- کہانیاں لکھتا ہے" بابا عصر نے کہا "اور میں وہ ہوں، جس کی قسم کھا کر اللہ رب العزت نے فرمایا کہ بے شک انسان خسارے میں ہے۔ سوائے ان کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے --- اور جو ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے رہے اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہے۔"

میں حیران رہ گیا مگر مجھ سے زیادہ حیران وزیراعظم تھے۔ بلکہ وہ تو ہل کر رہ گئے تھے۔ ہم پلٹے اور چل دیئے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وزیراعظم اسی جگہ کھڑے تھے۔ وہ کبھی اپنے ہاتھ میں موجود رومال کو دیکھتے تھے اور کبھی بابا عصر کو۔ اس دوران میں کئی بار انہوں نے سر جھٹکا۔

میں نے بابا عصر سے کہا "تو آپ ---"

"ہاں۔ کم از کم تمہیں تو پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا" وہ بولے "کتنے اشارے تھے تمہارے سامنے۔ میں کبھی رکتا نہیں' ہمیشہ چلتا رہتا ہوں۔ میری اپنی رفتار ہے۔ میرے ساتھ چلنے والے وہ لوگ فائدے میں رہتے ہیں' جنہیں ان کے اوصاف کی وجہ سے اللہ نے خسارے والوں سے مستثنیٰ کیا ہے۔"

"لیکن ابھی کچھ دیر پہلے آپ رکے ہوئے تھے؟" میں نے اعتراض کیا۔

"تو سبھی کچھ رک گیا تھا نا۔ اس وقت کوئی ہمارے درمیان مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔"

یہ بات درست تھی۔ مجھے اس کا احساس ہوا تھا۔

"میں اپنے بارے میں کہہ رہا تھا" بابا عصر پھر گویا ہوئے "جو مجھ سے نظریں چرائیں' میری شکایت کرتے رہیں' رونا روتے رہیں' میں ان لوگوں کے لئے سخت ہوں اور میں نے پہلی ملاقات میں ہی تمہیں بتایا تھا کہ جو میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھیں' میں ان کے لئے نرم ہو جاتا ہوں۔"

"جی ہاں۔ مجھے یاد ہے۔ واقعی مجھے آپ کو اسی وقت پہچان لینا چاہیے تھا" میں نے شرمندگی سے کہا۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر میں نے کہا "مجھے ایک اور بات پر حیرت ہے۔ وہ پوٹلی تو بہت بھاری تھی۔ میں تو اسے ہلا بھی نہیں سکتا تھا' وزیراعظم نے وہ کیسے اٹھالی؟"

بابا عصر مسکرائے "اللہ جب کسی کو کوئی بوجھ دیتا ہے تو اس کے لئے طاقت اور ظرف بھی عطا فرماتا ہے۔ وہ بوجھ تمہارے وزیراعظم کا تھا سو انہوں نے اٹھا لیا۔ تمہارا نہیں تھا' تم سے اٹھایا نہیں گیا۔"

چند لمحے بعد میں نے پوچھا "بابا --- ہم کراچی کب پہنچیں گے؟"

"کراچی؟ تو اس وقت ہم کہاں ہیں؟" بابا نے حیرت سے کہا۔

"جی --- !" میں نے سر گھما کر دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ میں کراچی میں ہی

نہیں' اپنے گھر کے بہت نزدیک تھا۔ سامنے وہ بلڈنگ نظر آ رہی تھی جس میں میرا فلیٹ تھا۔

"اب میں چلتا ہوں" بابا عصر نے کہا۔

"رات کو ملاقات ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"اب شاید ہم کبھی نہ ملیں" انہوں نے کہا۔ اتنی دیر میں وہ بہت دور جا چکے تھے پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

میں گھر جانے کے بجائے مسجد کی طرف چل دیا۔ فجر پڑھنے کے بعد میں گھر آیا۔ نیند اب بھی نہیں آ رہی تھی۔ میں لکھنے بیٹھ گیا۔ شاید نیند اس لئے اڑی ہوئی تھی کہ میں وہ سب کچھ لکھ لوں' جو اب خود بھی' مجھے خواب سا لگتا ہے۔ وہ سب لکھنے کے بعد مجھے نیند آگئی' میں سو گیا۔

ایک مہینہ گزر گیا۔ یہ اگست کا مہینہ ہے۔ میں متجسس بھی ہوں اور بے چین بھی۔ میں روز اسلام اور پاکستان کی عظمت اور سربلندی کے خواب دیکھتا ہوں لیکن جاگنے کے بعد مجھے زوال اور ابتری کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ہر طرف خوف' بے یقینی اور انتشار ہے۔ میں مایوس ہونے لگتا ہوں۔ ایسے میں میرے اندر ایک پراعتماد آواز ابھرتی ہے۔ مایوسی کفر ہے۔ جو اللہ کو منظور ہے' ہو کر رہے گا۔ ٹل نہیں سکتا۔ کب ہوگا' یہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بس تم دعا کرتے رہو۔ ہر گزرتے دن کی امید آنے والے دن کو سونپتے رہو۔ میں یہی کرتا ہوں۔

مجھے تجسس ہے۔ نہ جانے وہ اشرفیاں خزانے میں پہنچیں یا نہیں۔ بابا عصر نے کہا تھا کہ اگر آخری آدمی نااہل ثابت ہوا تو اشرفیاں ان کے پاس واپس آجائیں گی۔ پھر وہ انہیں اگلے آخری آدمی کے سپرد کر دیں گے' عرصہ ابتلا ذرا طویل ہو جائے گا۔

میں عشاء کے بعد ہر روز اس امید پر ٹہلتا ہوں کہ شاید بابا عصر سے ملاقات ہو جائے۔ ان سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اشرفیاں ان کے پاس پہنچی ہیں یا نہیں۔ لیکن ان سے ملاقات نہیں ہوتی۔ کل میں حارث بن عثمان کے پاس چلا گیا۔ انہوں نے بتایا کہ

انہوں نے بھی بابا عصر کو کہیں نہیں دیکھا۔ "تم اتنے پریشان کیوں ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

میں نے اپنی پریشانی بتا دی۔

وہ مسکرائے "اللہ کا شکر ادا کرو کہ تم نے اپنا کام کر دیا۔ اللہ مسبب الاسباب ہے' سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"لیکن کب؟"

"جب اس کی مرضی ہوگی" حارث نے دو ٹوک جواب دیا۔ ان کی انگلی آسمان کی طرف اٹھ گئی۔

"میں کیا کروں؟ بے حد مضطرب ہوں۔"

"اپنا کام کرتے رہو۔" حارث بن عثمان نے کہا "ہر پاکستانی کو پیغام پہنچا دو کہ سب کچھ بھول کر اللہ کی رسی تھام لے۔ محنت اور دیانت کو اپنائے۔ اللہ کے خوف کو دل میں بسائے۔ اللہ پر توکل کرے۔ اس سے خیرو برکت مانگے --- اپنے لیے بھی اور اس محبوب وطن پاکستان کے لئے بھی۔ اپنے عمل اور کردار سے خود کو تیار کرتا رہے تاکہ وقت آئے تو وہ سعادت مندوں میں سے ہو نہ کہ سرکشوں اور نافرمانوں میں سے۔ کہہ دو کہ اللہ کے عطا کردہ اس پاک وطن کے مفاد کو جان سے عزیز جانو۔ پریشانیوں سے نہ گھبراؤ۔ تمہیں غلام بنانے کا خواب دیکھنے والے کامیاب نہیں ہوں گے۔ اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔ کہہ دو کہ یہ رات سدا رہنے والی نہیں۔ اس سے گھبرا کر ان تیرہ بختوں میں شامل نہ ہو جانا' جو اس رات کا حصہ بننے والے ہیں۔ جنہیں ظلمتوں میں کھو جانا ہے۔ اللہ کی عبودیت' رسول کریم کی سیرت پاک کی پیروی' دین کی پاس داری' استغفار' تسبیح اور قوم اور وطن کی سچی محبت کا زاد راہ لے کر اس روشن صبح کا صبر کے ساتھ انتظار کرو' جو اللہ کے حکم سے بالاخر آنی ہے۔ تب تمہارے اجر ہی اجر ہوگا۔ اللہ کا انعام ہوگا۔"

میں اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور اللہ سے تائید طلب کرتا ہوں۔

اللہ آپ سب پاکستانیوں کو --- اور دنیا بھر کے مسلمانوں کو سلامتی اور خیرو برکت سے نوازے۔ آپ بھی ایسا ہی کریں۔ اللہ ہم سب کو سیدھا راستہ دکھائے اور گمراہی سے نکالے۔ اللہ ہمیں جذبہ جہاد سے نوازے۔ اللہ اسی لمحے سے ہماری زندگی میں وہ انقلاب لائے' جو ہدایت آفریں ہو۔ جو ہمیں صرف اس کا مطیع و فرماں بردار بنا دے' آمین۔

مگر میں اب بھی یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر خدانخواستہ وہ اشرفیاں ابھی تک قومی خزانے میں نہیں پہنچی ہیں تو کب پہنچیں گی --- اور یہ سعادت کسے ملے گی؟

○